ستمبر 2007

قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

دوروزہ 29ویں بین الاقوامی اردو کانفرنس منعقدہ 31-30 جولائی حیدرآباد سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید۔ ساتھ میں بیٹھے ہوئے (بائیں سے) جناب جلیل پاشاہ بانی وصدر نشین کل ہند اردو تعلیمی میٹی، جناب ایس۔ جے۔ پال ریڈی مرکزی وزیر شہری ترقیات حکومت ہند، جناب وی ہنمنت راؤ رکن پارلیمنٹ راجیہ سبھا، پروفیسر ایم۔ جے۔ وارثی اور جناب آفاق احمد بھی تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ایک تقریب میں تمل ناڈو کے گورنر سردار سرجیت سنگھ برنالہ، سید محمد اسمٰعیل صاحب کو ان کی خدمات کے لیے شیلڈ دیتے ہوئے۔ ساتھ کھڑے ہیں پرنس آف ارکاٹ نواب محمد عبدالعلی صاحب۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔9 ستمبر 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ادارہ 6

زبان اور تعلیم
- اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف — شمس الرحمٰن فاروقی 7
- اعلیٰ تعلیم میں شمولیت — سکھ دیو تھورات/سراج احسن 8
- بچوں کی تربیت: آزادی اور پابندی — محمد نعیم اختر ندوی 10
- سندھ میں اردو — رابعہ سرفراز 12

ادب
- خط اور غزل — حمایت علی شاعر 14
- قسمت (گجراتی کہانی سے) — ہرشد ترویدی/خورشید عالم 15

تاریخ و ثقافت
- جھوٹ میں سچ (گاہے گاہے باز خواں) — مولانا عبدالماجد دریابادی 19
- موبائل تھیٹر — انجم نعیم 22
- ''بھوپال پنچ'' — بھوپال کا ایک یادگار اخبار — عارف عزیز 24

صحت، ماحولیات اور سائنس
- مستقبل میں الگی پودے بطور غذا — محمد خلیل 26
- گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج اور ہندوستان — اسعد فیصل فاروقی 28
- ربیز — ایک مہلک مرض — امیر بانو 30

روبرو
- احمد فراز سے بات چیت — سلیم صدیقی 32

کیریئر
- کرنے کے کام — عبدالعلیم قدوائی 34
- آرکیالوجی میں کیریئر — اے۔این۔شبلی 36

ہماری مطبوعات سے
- شعر کی تعریف میں — حکیم نجم الغنی خاں نجمی 39
- قومی یکجہتی اور ہندوستانی زبانیں — مسعود حسین خاں 43

اردو خبرنامہ ادارہ 49
تبصرہ و تعارف کتابوں پر تبصرے 66

بچوں کا گوشہ
- عظیم سائنس داں پروفیسر عبدالسلام — انور ادیب 74
- ایمبولینس کی کہانی — خسرو متین 76

آپ کی بات

■ شریف الدین خاں، سپرنٹنڈنٹ کم ضلع آیوروید ادھیکاری، نزد امانا کا یونیورسٹی، رائے پور (سی.جی.)-492010

''اردو دنیا'' اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق بہت خوبصورت ہے۔ ''ہماری بات'' اردو سے محبت کرنے والوں اور اس کی ترقی چاہنے والوں کے لیے ایک آزمائش ہے۔ کرشن چندر کا انٹرویو بھی پڑھا، ان کی تحریر سے کافی متاثر ہوا۔ لفظ لفظ سے اردو کا درد جھلکتا ہے۔ خالد سعید کا مضمون ''اردو: مضمون کہ ذریعۂ تعلیم'' ایک اچھا مضمون ہے۔ ''غیر اردو دانوں کے لیے اردو رسم الخط کا تعارف''، ''مغربی بنگال میں اردو کی صورت حال''، ''پیٹنٹ دینے میں تحقیق کی ضرورت''، ''خفقان ___ اختلاج قلب'' سب مضمون معیاری ہیں اور مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''اردو خبرنامہ'' کے ذریعے، پورے ملک میں اردو کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے اس کی تفصیلی رپورٹ حاصل ہو جاتی ہے۔

آزادی کے بہت سال بعد تک اردو پر جمود طاری تھا۔ رفتہ رفتہ اردو کے لیے کچھ کام شروع ہوا۔ اس سلسلے میں بہت سے اداروں نے کام شروع کیا جن میں اردو اکادمیاں، مدرسہ بورڈ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وغیرہ شامل ہیں۔ انجمن ترقی اردو، پرانی تنظیم ہے مگر اب زیادہ سرگرم نہیں ہے ایسا لگتا ہے۔

اردو کے لیے اب بہت سے دروازے کھل رہے ہیں نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر فرقوں کے لوگ بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ چھتیس گڑھ میں راج ناندگاؤں ایک شہر اور ضلع ہے۔ یہاں ایک ڈاکٹر رشمی پارکھ ہیں جو 1957 میں ناگپور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے علاقائی صدر رہ چکے ہیں۔ میڈیکل کی تعلیم کے وقت اردو میں مہارت حاصل کی۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اردو کا کوئی جواب نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی اردو لائبریری بنائی ہے۔ روزانہ دو گھنٹے اردو کے لیے کام کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ بہو اور بیٹیاں بھی اردو جانتی ہیں۔ ان کا لڑکا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔

دہلی پبلک اسکول کے سابق پروفیسر جناب شرما سب سے پہلے چھتیس گڑھ میں اردو کمپیوٹر لائے۔ ہر مہینے اپنی رہائش گاہ پر مشاعرے یا نشست کا انتظام کرتے تھے، وہ اب ہریانہ میں ہیں۔

درگ میں ایک شاعر تھے جو ایک مزار کے عقیدت مند تھے گیا پرشاد بے خودی بہت اچھے شاعر گزرے ہیں اردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ ان کی کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔

بھلائی اسٹیل پلانٹ کے سابق جنرل منیجر جناب کیشو صاحب اردو کے شیدائی تھے، اپنی مادری زبان اردو تحریر کرتے تھے۔

راج ناندگاؤں میں ایک مدرسہ ہے جہاں قریب 300 بچے زیر تعلیم ہیں اور 85 بچے غیر مسلم ہیں جو اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو رہے ہیں۔ میں نے ان کے والدین سے دریافت کیا کہ آپ اپنے بچوں کو یہاں کیوں پڑھا رہے ہیں؟ ان کا جواب تھا کہ بچے مہذب، فرماں بردار، والدین کی عزت کرنے والے ہوتے ہیں اور اردو جیسی میٹھی زبان سے واقفیت ہوتی ہے۔

لکھنے کا مقصد یہ کہ اردو کے لیے غیر مسلموں کو بھی دلچسپی ہے۔ ''اردو دنیا'' اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اور یہ محنت رایگاں نہیں جائے گی۔ اردو والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اردو کو اپنائیں۔

■ محمد اسحاق، جاوید منزل، ہاؤس نمبر 11-4-614/6، بازارگارڈ، حیدرآباد-500004

اگست کا ''اردو دنیا'' تین روز قبل ہی مل گیا۔ مضامین کی ہمہ رنگی اور معیار کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ تعریف و توصیف کے لیے جی چاہتا ہے۔ ایک طرح یہ ایک Readings Digest ہے کیوں کہ مختلف مضامین زماں و مکاں کی قید سے آزاد ___ یکجا کردیے گئے ہیں، جنھیں پڑھ کر قاری کی معلومات اور وسعت نظر میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان و بیان کا یہ ایک حسین گلدستہ ہے جسے ہاتھ میں لے کر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا کالم بے حد مفید ہے۔ اردو زبان پر موصوف کی مہارت و معلومات قابل رشک ہیں۔ کرشن چندر کا انٹرویو آج بھی اتنا ہی معنی خیز ہے جسے وہ عرصہ پہلے دے چکے تھے۔ صفحہ -41 پر ''کرشن چندر سے ایک کالمہ'' لکھا ہے۔ کالمہ کہیں کتابت کی غلطی تو نہیں ہے (1)۔

میری خاص دلچسپی کا مضمون خالد سعید کا ہے ''اردو: مضمون کہ ذریعۂ تعلیم'' اس مضمون پر کچھ لکھنا چاہا لیکن گذشتہ 30,25 برسوں میں اس عنوان کے مختلف پہلوؤں پر ایک درجن سے زیادہ مضامین لکھ چکا ہوں۔ اپنی دو کتابیں ''تعلیم ایک تحریک، ایک چیلنج'' اور ''متفرق مضامین'' آپ کے ادارے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ ان کتابوں میں اردو زبان اور تعلیم پر 40, 50 مضامین مل جائیں گے۔ متفرق مضامین میں ایک مضمون ''ذریعۂ تعلیم مادری زبان یا انگلش'' صفحہ 20 پر موجود ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ''اردو دنیا'' میں شائع کردیں۔ ان کتابوں کے اکثر مضامین ''اردو دنیا'' کے مزاج اور مشن سے عین مطابقت رکھتے

ہیں۔ چند ایک ''اردو دنیا'' میں شائع کردیں تو مشکور رہوں گا۔

(1) ہم کمپوزنگ کی اس غلطی کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں — ادارہ

■ محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد-503002 (آندھراپردیش)

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ یکم اگست 2007 کو ہمدست ہوا۔ تازہ شمارہ بروقت ملنے سے آسودگی حاصل ہوتی ہے اور یہ ''اردو دنیا'' کی خاص خوبی ہے کہ وہ وقت پر آجاتا ہے۔ عالمیت کے اس دور میں دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے۔ علم کا پھیلاؤ ہورہا ہے۔ مختلف علوم وفنون کی ترسیل لمحوں میں انٹرنیٹ کے ذریعے قاری تک ہورہی ہے۔ ادب عصری زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر ادب میں ماضی میں جام جمشید کا ذکر آیا ہے تو اس کی ترقی یافتہ شکل یا اس سے اخذ کردہ نئی ایجاد انٹرنیٹ ہے جس میں پورا عالم ایک جھلک میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسا ہی کردار ''اردو دنیا'' ادا کررہا ہے۔ اس میں صرف ادب ہی نہیں بلکہ مختلف علوم وفنون پر مضامین شائع کیے جارہے ہیں۔ اسے پڑھ کر قاری کو مکمل تسکین ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کے علوم سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ رسالہ اردو قاری کو عصری مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں منہمک ہے۔ اس کے مضامین مسابقتی امتحانات کے لیے بھی کارآمد ہیں۔ اردو کا شاید ہی کوئی رسالہ اپنے دامن میں اس طرح کا مواد لیے ہو۔ یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور کامیابی وکامرانی کا اہم زینہ بھی۔ ہر اردو خاندان میں اس کی موجودگی سے منزلوں کا حصول آسان ہوجائے گا۔ ہر اردو داں کا فرض ہے کہ وہ اس کا خریدار بن کر اس کے مشن کی تکمیل میں تعاون کرے اور اس سے کما حقہ استفادہ کرے۔ زیر مطالعہ شمارہ ماہ اگست 2007 کا ہے۔ اداریے میں اہم باتیں کہی گئی ہیں۔ اردو والوں کا یہ خیال کرنا کس قدر غلط ہے کہ اردو پڑھنے سے ہمارے بچے دوسرے بچوں سے پچھڑ جائیں گے۔ روزی روٹی کے معاشی تصور کی بنا پر ہی اردو والے انگلش کی طرف راغب ہوگئے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ملکی وقومی سطح پر انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو ایک مضمون کے طور پر رائج کرنے کی کوشش کریں۔ دور آگیا ہے زبانوں کو معاشی تناظر میں دیکھنے کا۔ حالانکہ زبان شخصیت سازی اور کردار سازی کا بہترین ذریعہ ہے۔ آج بھی ماہرین تعلیم یہی کہتے ہیں کہ بچے کو مادری زبان سکھانی چاہیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کالم معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس کالم کے ذریعے قاری کو لسانی اور ادبی باریک سے باریک معلومات حاصل ہورہی ہیں۔ جناب خالد سعید کا مضمون ''اردو: مضمون کہ ذریعہ تعلیم'' میں بہت صحیح باتیں کہی گئی ہیں۔ ''غیر اردو والوں کے لیے اردو رسم الخط کا تعارف'' بھی اچھا مضمون ہے۔ اردو رسم الخط بہت سادہ ہے آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے۔ محمد وجیہ الدین جمال نے ''مغربی بنگال میں اردو کی صورت حال'' پر روشنی ڈالی ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی غزل گوئی کے حوالے سے شہپر رسول نے نئی دریافت کی ہے۔ آغا حشر کاشمیری ڈراما کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں لیکن غزل میں بھی وہ اہم مقام رکھتے ہیں یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ اردو نے یقیناً 1857 کی جدوجہد آزادی میں حرکیاتی رول ادا کیا۔ ''پھول والوں کی سیر'' دلی کی تہذیب کا آئینہ ہے۔ قومی یک جہتی کے فروغ کا وسیلہ ''ماحول کے مضر اثرات'' سلگتا ہوا موضوع ہے اور اچھا تجزیہ کیا ہے۔ ہر قسم کی آلودگی سے انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ شجر کاری اور جنگلات کو فروغ دینا ہوگا۔ ماحولیاتی عدم توازن کی وجہ سے ہی فطرت برہم ہے اور اس کے مضر اثرات موسم میں تبدیلی، سیلاب سونامی وغیرہ بن کر آرہے ہیں۔ یہ انسانی عمل کا نتیجہ ہے کہ وہ فطرت میں بے جا مداخلت کررہا ہے جس سے عدم توازن پیدا ہورہا ہے۔

■ ارشد کمال، مین روڈ، رانچی، جھارکھنڈ

اگست کا ''اردو دنیا'' اپنی دلچسپیوں کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ اس میں معاشیات، سماجیات، جغرافیہ، نفسیات، فلسفہ، طب اور سائنس کے تعلق سے مضامین کی شمولیت وقت کی ضرورت ہے۔ اردو کے اکثر رسالے ادبی نوعیت کے ہیں اور صرف شعر وادب سے اردو زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے وقت کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

اتر پردیش میں اردو کے احیا کی ضرورت ہے۔ مایاوتی کی حکومت سے اردو والوں کو اپنے مطالبات منوانے میں مدد مل سکتی ہے۔ بس ارادے اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ آخر اتر پردیش میں اردو کی ترقی کے تعلق سے اخبارات و رسائل میں مضامین/رپورٹ کیوں شائع نہیں ہوتے؟

■ جمیل ظہیر، ملاؤ، 418/اے نیو کالونی، نیو کریم گنج، گیا-823001

''اردو دنیا'' ماہ جولائی 2007 میں اردو کی درسی کتابوں کی نایابی سے متعلق آپ کا اداریہ اور اندرونی صفحات میں جناب ایم آئی ساجد کا مضمون ''پرائمری سطح پر اردو کا نصاب'' اور محترمہ قدسیہ اختر کا مضمون ''اردو ذریعہ تعلیم'' نے مجموعی طور پر اس شمارے کو اردو نمبر کی حیثیت دے دی ہے۔ جہاں ایم آئی ساجد نے اردو کے نئے نصاب کے پس منظر میں اردو کے متوقع بڑھتے ہوئے معیار کا جائزہ لیا ہے وہیں محترمہ قدسیہ اختر نے گریجویٹ سطح پر طالب علموں میں گرتے ہوئے معیار کی نشاندہی کی ہے لیکن محترمہ قدسیہ اختر نے گرتے ہوئے معیار کی ایک وجہ ہندی رسم الخط کو قرار دیا ہے۔ بظاہر ایسا نہیں ہے۔ اردو والوں نے باضابطہ طور پر اب تک ہندی رسم الخط کو تو نہیں اپنایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تمام کلاسوں کے سارے مضامین کی درسی کتابیں یا تو انگریزی یا ہندی میں دستیاب ہیں۔ انگریزی عام طالب علموں کے بس کی نہیں

پڑتی اس لیے وہ ہندی کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ہندی زبان کا تلفظ اور املا اردو پڑھنے والے طالب علموں پر پورے طور پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اس کو کیا کہیے گا کہ اردو والے خود مخصوص الفاظ کی املا کی شرط کو نہیں نبھاتے۔ وہ اعجاز کے ساتھ ریاض کا قافیہ باندھتے ہیں، شجاع تخلص اختیار کرتے ہیں لیکن مقطع میں شجاع کی عین کو تقطیع میں شمار نہیں کرتے۔

جناب جاوید رحمانی کا تبصرہ قرۃ العین حیدر کی کلیات ''آئینۂ جہاں'' جلد دوم پر تبصرے کا حق نہیں ادا کرتا۔ تبصرے کا آغاز موصوف نے پروفیسر عبدالمغنی کے اس قول سے کیا ہے کہ وہ (قرۃ العین حیدر) سب سے بڑی فکشن رائٹر ہیں لیکن ممدوح جب مداح سے کافی اونچی حیثیت کا مالک ہو تو اس کا قول یا اقتباس خاطر خواہ اثر نہیں ڈالتا۔ اس کے علاوہ ''آئینۂ جہاں'' جلد اوّل کا ایک افسانہ ''شام'' جو ''ادیب'' نومبر 1943 میں لالہ رخ کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر خود رقم طراز ہیں کہ ''اس افسانے کے بعد میری ہمت بندھی اور میں نے دوسرا افسانہ ''یہ باتیں'' اپنے نام سے لکھا اور ''ہمایوں'' میں بھیجا وہ بھی ''ہمایوں'' 1944 میں چھپ گیا۔ اس کے بعد میں نے مزید کہانیاں لکھیں جو کسی ایڈیٹر نے واپس نہیں کیں۔'' لہٰذا ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا 1943 سے سمجھی جانی چاہیے لیکن رحمانی صاحب نے ان کی افسانہ نگاری کی ابتدا 1945 سے بتائی ہے جو مذکورہ سیاق عبارت کے لحاظ سے درست نہیں۔ اس تبصرے میں آگے چل کر جناب رحمانی نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کو اردو کا سب سے بڑا اور متنازعہ ناول کہا ہے۔ اگر بڑا سے ان کا مطلب ضخیم ناول سے ہے تو وہ حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول'' ہے۔ ''آگ کا دریا'' میں کئی متنازعہ فیہ مضامین کو ضرور ضبط تحریر میں لایا گیا ہے مثلاً روح کیا ہے؟ مادے کی مختلف شکلیں اس سے کیا تعلق رکھتی ہیں؟ فنا کا تصور کیا ہے؟ بقا کس حالت کی نشان دہی کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن یہ ناول بذات خود متنازعہ فیہ نہیں ہے۔

■ **خورشید عالم، ڈی-92، سیکٹر-23، راج نگر، غازی آباد**

''اردو دنیا'' کے مضامین ہماری نئی نسل کے لیے اہم معلومات کا اچھا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔

جولائی کے شمارے میں ''انٹرنیٹ کے نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر'' بہت اچھا مضمون ہے۔ اس طرح کے مضامین بچوں کو اچھا شہری بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ''اردو دنیا'' کا مطالعہ کرنے اور اسے پسند کرنے والوں کی خاصی تعداد یہاں ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ بھی ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ ہیں جنھوں نے مجھے اور بہت سے ساتھیوں کو اردو کی طرف راغب کیا۔ وہ ''اردو دنیا'' کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں اور ہمیں بھی پابندی سے مطالعہ کراتے ہیں۔ وہ بزرگ ہیں ڈاکٹر نند کشور بھولا۔ پنجاب سے تعلق ہونے کی وجہ سے اردو کا بہت شوق ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو رہی ہے اور آج بھی اردو سے محبت برقرار ہے۔

■ **سرور ساجد، ناظر خان لین، مین روڈ، رانچی**

جولائی 2007 کا ''اردو دنیا'' پیش نظر ہے۔ رسالہ دن بہ دن بہتری کی طرف گامزن ہے۔ فاروقی صاحب ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' کے تحت بھرپور علمی اور معلوماتی تحریریں قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ سید احمد شمیم کے مجموعۂ کلام ''بے در و دیوار'' کے حوالے سے موصوف نے جو رائے رقم کی ہے وہ ان کی علمی اور ذہنی کشادگی کا نمونہ ہے۔ ''مشاہدات زنداں'' کے حوالے سے انور محمود خالد کی تحریر نہایت دلچسپ ہے لیکن اس قدر اختصار میں انھوں نے باتیں کی ہیں کہ تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حسرت موہانی کی یہ نایاب تحریر آپ مکمل طور پر از سر نو شائع فرما دیں تا کہ موجودہ نسل بزرگوں کی مشق سخن اور چکی کی مشقت دونوں سے ہی اپنا رشتہ استوار کر سکے۔

■ **نیاز جیراجپوری، 67 جالندھری، اعظم گڑھ-276001**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کے عہدے پر آپ کی تقرری باعثِ مسرت ہے۔ مبارک ہو۔ اس خبر سے تو بے پناہ خوشی ہوئی کہ این سی پی یو ایل، کے حیدرآباد کے واحد علاقائی مرکز کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مزید مراکز قائم ہونے والے ہیں۔ میں اپنی طرف سے اور ماہنامہ ''شاندار'' کی طرف سے آپ جیسے فعال اور متحرک اردو دوست کو ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید بلکہ یقین کرتا ہوں کہ آپ کی سربراہی میں قومی اردو کونسل خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہے گی۔ انشاء اللہ......

■ **کوثر صدیقی، کاروانِ ادب، زیب ولا، 79-اے، گنوری مین روڈ، بھوپال-462001 (مدھیہ پردیش)**

فروغ اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے پروقار عہدے پر آپ جیسی لائق اور جلیل القدر شخصیت کے متمکن ہونے پر خاکسار کی جانب سے نیز اراکین ''کاروانِ ادب'' کی جانب سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ کی قیادت میں یہ ادارہ خوب ترقی کرے اور اردو کے فروغ کی منزلیں طے کرے۔

■ **پریمی رومانی، 1/3، نصیب نگر، پیوش کالونی، جانی پور، جموں-180007**

آپ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا ہے۔ یہ جان کر از حد خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ آپ کی سربراہی میں یہ

ادارہ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہوگا۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' مسلسل آتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا الگ اور انفرادی ماہنامہ ہے۔ پوری اردو دنیا کی تمام خبریں گھر بیٹھے پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مخمور سعیدی جیسے شاعر دانشور اور صحافی کی ادارت میں اور آپ کی سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ جریدہ مقبول خاص و عام ہوتا جارہا ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی محنت، لگن اور صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ ادارہ اسی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہے۔

■ ارشد کمال، جی۔64، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

''اردو دنیا'' میں ابوبکر عباد کا مضمون ''بنگال نشاۃ ثانیہ اور اردو'' نظر سے گزرا۔ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مضمون کے آخر میں مصنف نے کلکتہ کے آج کے جن فعال قلمکاروں کا ذکر کیا ہے ان میں دو ایک نو واردوں کے نام تو آگئے ہیں لیکن علقمہ شبلی، نصر غزالی، جعفر ساہنی اور منور رانا جیسے قلم کاروں کے اسمائے گرامی کا نہ ہونا حیران کن ہے۔ زندہ شعرا اور ادبا کی فہرست میں اعزاز افضل کو شامل کیا گیا ہے جو آج سے تقریباً دو سال قبل ملک عدم کو سدھار چکے ہیں۔ امید ہے کہ میرا مراسلہ شامل اشاعت کرلیا جائے گا۔

■ شمیم احمد صدیقی، سی-2، نسیم منزل، مدح گنج، پولیس پوسٹ، سیتاپور روڈ، لکھنؤ-226020

عرض ہے کہ لمبے سفر پر رہنے کی بنا پر مئی اور جون کے ''اردو دنیا'' کے شماروں کو اب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مخمور سعیدی صاحب نے صرف ایک صفحے میں ڈاکٹر علی جاوید کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔ بلاشبہ ''اردو دنیا'' کے معیار پر اس کے تمام قارئین کو بجا طور پر فخر ہے۔ کبھی کبھار خوب سے خوب تر بنانے کے لیے طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ متوجہ کیا جائے۔ مثلاً مئی اور جون کے شماروں میں ''ہماری مطبوعات'' کالم کے تحت مضامین ''مونالیزا'' اور ''نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری'' نے گذشتہ شماروں کے مقابلے میں دوگنے، تین گنے صفحات لے لیے یہ زائد صفحات ''تبصرہ و تعارف'' میں بہتر طور پر استعمال ہوسکتے تھے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ جن مرحوم اور گمنام شعرا کا بلند پایہ کلام کسی وجہ سے شائع نہ ہوسکا یا شائع تو ہوا لیکن کسی وجہ سے مقبول نہ ہوسکا، ان کو متعارف کرانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ مثلاً دہلی کے کیلاش نرائن کول بیدل، عظیم آبادی کی جمیلہ خدا بخش، گنگوہ کے حکیم فہیش احمد کیف، جے پور کی اُمّ مشتاق، بجنور کے ریاست حسین فکر وغیرہ۔

□□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جغرافیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نوراللہ / جے. پی. نائک

مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

ہماری بات

اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ثقافت کو پروان چڑھانے والی سب سے طاقتور زبان ہے۔ آزادی کی لڑائی میں بھی اردو نے بہت موثر کردار ادا کیا۔ ''انقلاب زندہ باد'' اور ''ہندوستان چھوڑ دو'' جیسے نعرے جن کی گرج نے سامراجی نظام کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا، اسی زبان میں لگائے گئے۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد اس زبان کے بارے میں بدگمانیوں کو اس طرح ہوا دی گئی کہ وہ عام ہوگئیں، خصوصاً شمالی ہندوستان میں۔ نتیجتاً اس کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئیں ان کے ہم سب شاہد و ناظر ہیں۔ ان ناانصافیوں کا جواز اس پرفریب نظریے میں تلاش کیا گیا جسے انگریزوں نے پالا پوسا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ نظریہ اس وقت باطل ہوگیا جب مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اردو اور اردو بولنے والوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور بنگالی کو اپنی قومی شناخت کے طور پر تسلیم کرانے کے لیے بالآخر پاکستان کے دو ٹکڑے کرا دیے اور برصغیر میں ایک اور نئی مملکت بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آگئی۔

بہرکیف، اب کہ ہم اپنی آزادی کی ساٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں جو ہنگامی سیاست نے پیدا کر دی تھیں، ان کی تاریک دھند چھٹنے لگی ہے تو اردو کے تئیں بھی شکوک و شبہات دور ہونے لگے ہیں، یہ ہماری قومی زندگی کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے، اس کی آبادی کروڑوں میں ہے جس میں مختلف نسلوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف مذہبوں اور مسلکوں کو ماننے والے، مختلف ثقافتوں اور ذیلی ثقافتوں کی نمائندگی کرنے والے اور مختلف زبانیں اور بولیاں بولنے والے شامل ہیں۔ ملک کے اتحاد و سالمیت کے لیے اس کثرت میں وحدت کی نمود ضروری ہے جو دو ہی زبانوں کے وسیلے سے ممکن ہے، یہ زبانیں ہیں ہندی اور اردو جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، اس کا خمیر ہی مختلف نسلی، مذہبی اور لسانی اکائیوں کے باہمی میل جول سے اٹھا ہے اس لیے وہ کشادہ دلی اور وسیع المشربی اس کی سرشت میں شامل ہے جس کے اثر سے بڑے سے بڑے حریف کو اپنا حلیف بنایا جاسکتا ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنا لینے اور اپنے سانچے میں ڈھال لینے اور مختلف المزاج لوگوں کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ کر لینے کی جو صلاحیت ہے، اس سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ اردو نے اپنے بولنے والوں کو ہر مذہب و مسلک کا احترام کرنا سکھایا ہے۔ اردو شاعری کے ذخیرے پر ایک سرسری نظر ڈالیے، آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف ہندو شعرا نعت اور منقبت لکھ رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمان شعرا رام اور کرشن کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ یگانہ نے اپنے لیے ایک جگہ کہا ہے:

کرشن کا ہوں پجاری، علی کا بندہ ہوں

اردو اور اردو والوں کا عمومی انداز نظر یہی ہے اور ہندوستان کی نئی تہذیبی فضا کی تشکیل و تعمیر میں اس انداز نظر کو ملحوظ رکھنا اور اس پر عمل پیرا ہونا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

آخر میں ایک بات اردو رسم الخط کے بارے میں۔ گاہ بہ گاہ اردو کے بعض کم اندیش بہی خواہ اردو کی مزید ترویج و توسیع کے لیے یہ مشورہ دیتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ اردو کا موجودہ رسم الخط ترک کر دیا جائے اور اس کی جگہ دیوناگری لپی اختیار کر لی جائے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی زبانیں ہیں، اتنے ہی رسم الخط بھی ہیں، پھر یہ نیک مشورہ صرف اردو ہی کو کیوں دیا جا رہا ہے، دوسری زبانوں کو کیوں نہیں؟ اگر دوسری زبانیں اپنے اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہیں، ترقی کر سکتی ہیں تو اردو سے اس کا رسم الخط کیوں چھینا جائے؟ رسم الخط لباس نہیں کہ آسانی سے تبدیل کر لیا جائے۔ زبان اگر جسم ہے تو رسم الخط جلد کی طرح ہے، جسم کی کھال ادھیڑ دی جائے تو کیا اس میں جان باقی رہ سکے گی!

اردو رسم الخط کی ایک سیاسی اہمیت بھی ہے۔ ہماری ایک ریاستی زبان کشمیری کے حروف تہجی اور سندھی زبان کا رسم الخط بھی اردو سے ملتا جلتا ہے۔ پھر ہمارے کئی پڑوسی ملک ہیں جہاں اس رسم الخط کا چلن ہے۔ مثلاً ایران، افغانستان اور پاکستان۔ اس فہرست میں عرب ملکوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے کہ عربی رسم الخط بھی اردو رسم الخط سے بہت قریب ہے، اس طرح اردو اپنے رسم الخط کے ساتھ دوسرے ممالک میں ہماری سفارت کا فریضہ بھی انجام دے سکتی ہے۔

اردو نے ماضی میں بھی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دیا ہے اور اسے قدرتی انداز میں پھولنے پھلنے کے مواقع ملتے رہیں تو وہ آج بھی یہ فریضہ موثر طور پر انجام دے سکتی ہے اور ہمارے لیے ایک شاندار تہذیبی مستقبل کی نقیب بن سکتی ہے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: اردو کے پینتیسویں حرف ہمزہ (ء) کے صحیح استعمال کا تعین کیسے ہو؟ ی، ے، و، کو جہاں کھینچ کر پڑھنے کی ضرورت ہو وہاں تو ان حروف پر ہمزہ لگانے کی بات سمجھ میں آتی ہے، جیسے کئی، گئی، کھائیے، آؤ وغیرہ لیکن شعراء اور رؤساء کی محفل میں حضرت ہمزہ کیسے داخل ہوگئے؟ (شعرا اور رؤسا کے بجائے شعراء اور رؤساء بھی بہت سے جریدوں میں دیکھنے کو ملتا ہے)۔ برائے خدا واضح کرنے کی عنایت فرمائیں کہ آیا، برائے خدا، صحیح ہے؟ رائے (opinion) لکھنا ٹھیک ہے یا 'رائ'؟ ہمزہ بطور Vowel تو ہندی کے (ए, ऐ, ई) جیسا آہنگ دیتا ہے لیکن بطور Consonant بھی کیا اس کا کوئی استعمال ہے؟

جواب: ہمزہ کے بارے میں میں بار بار گذارش کر چکا ہوں کہ یہ اردو کا ایک حرف ہے عربی میں اس کی حیثیت جو کچھ بھی ہو۔ Vowel اور Consonant کی بحث اردو کے لیے غیر ضروری ہے۔ موٹی بات یہ ہے کہ اردو کے الفاظ میں ہمزہ عام طور پر وہی کام کرتا ہے جو الف سے لیا جاتا ہے بشرطیکہ الف کو ذرا سہل کر کے بولا جائے۔ ''برائے'' میں ہمزہ ہو یا نہ ہو، اس کے بارے میں بہت پہلے اسی کالم میں عرض کر چکا ہوں کہ دونوں صحیح ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ عبارت میں ایک ہی املا استعمال کیا جائے۔ ''رائے'' میں ہمزہ اصل عربی میں نہیں ہے، لیکن اب یہ لگ گیا ہے اور مقبول اور رائج ہوگیا ہے۔ اسے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح ''رائے'' بمعنی سردار، راجا، یعنی فارسی رائے میں بھی ہمزہ ہے اور اسے بھی صحیح ماننا چاہیے۔

جہاں تک سوال عربی کے بہت سے ایسے الفاظ کا ہے جن میں عربی کے قاعدے کے اعتبار سے آخری حرف الف اور اس کے بعد ہمزہ ہے جیسے (دعاء، بناء، علماء وغیرہ) ان کے بارے میں اردو کا عام اصول یہ ہے کہ ایسا ہمزہ جو عربی لفظ کے آخر میں الف کے بعد آتا ہے، اسے نہ لکھا جائے۔ چنانچہ اردو میں دعا، بنا، علما بغیر ہمزہ ہی درست ہیں۔

میں اپنی کسی گذشتہ تحریر میں اس بات کی طرف دھیان دلا چکا ہوں کہ آج کل مذکورہ بالا قسم کے لفظوں میں ہمزہ لگانے کا رواج کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ ایسے الفاظ کے آخر میں بھی ہمزہ لگا دیتے ہیں جہاں ہمزہ سرے سے ہے ہی نہیں جیسے انگریزی کے لفظ Law کو لاء لکھتے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور اس پر ہرگز عمل نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: لفظ مآب صحیح ہے یا معاب۔ محمد مصطفیٰ خاں مداح کی لغت میں معاب جیسے فضیلت معاب مستعمل ہے جبکہ بشیر احمد قریشی کی لغت میں مآب ہے۔

جواب: صحیح لفظ مآب ہے۔ اس کے معنی ہیں بار بار واپس آنے کی جگہ۔ چونکہ لوگ اپنے گھر اور اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹتے ہیں اس لیے اسے ''گھر'' یا ''ٹھکانہ'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لہٰذا فضیلت مآب کے معنی ہوئے وہ شخص فضیلت جس کا گھر ہو یا ٹھکانہ ہو۔ اسی طرح عزت مآب، جلالت مآب وغیرہ ترکیبیں ہیں۔ معاب کوئی لفظ نہیں اور اگر ہے بھی تو مآب کے معنی میں نہیں ہے۔

سوال: ذکی اور زکی سے اذکی اور ازکی لکھنا ٹھیک ہے یا اذکا اور ازکا؟

جواب: عربی کے الف مقصورہ کو الف سے بدلنے کو میں غیر ضروری اور غلط سمجھتا ہوں اس لیے میں ادنا، اعلا، دعوا وغیرہ کے املے قطعی غلط قرار دیتا ہوں۔ ادنیٰ، اعلیٰ، دعویٰ لکھنا چاہیے۔ اس حساب سے ذکی/اذکی اور زکی/ازکی ہی لکھنا صحیح ہے۔

(سوالات از: ٹی۔این۔سریواستو، رئیس پٹھاری، معرفت بیجے بہادر سنگھ، نمبر S-24/6A-K-3، پرتاپ نگر کالونی،
جکتارپور، وارانسی-2)

□□□

سکھ دیو تھوراٹ

اعلیٰ تعلیم میں شمولیت

منصوبہ بندی کے موجودہ طریقے میں جامع معاشی ترقی کے لیے تعلیم کو اہم جز کی حیثیت سے شامل کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم تک ان تمام طبقات کی رسائی ہو جو اب تک اس سے محروم رہے ہیں۔ اب تک ایک محدود طبقے کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک رہی ہے اور وہی اس سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ ایک جامع تعلیمی پالیسی جس میں تمام طبقات کے لوگ شامل ہوں اس کے لیے ضروری ہے کہ ان طبقات کی پہچان ان کی ان مجبوریوں کے ساتھ کی جائے جس کی وجہ سے وہ تعلیمی عمل میں شریک نہیں ہو سکے۔

اعلیٰ تعلیم تک عدم رسائی کی بہت ساری وجہیں اور رکاوٹیں ہیں اور یہ صرف امیر اور غریب کی تفریق میں نہیں ہیں بلکہ یہ سماج کے مختلف طبقات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک بڑی وجہ ذات، مذہب، نسل اور جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔

2000 کے قومی اعداد و شمارے کے مطابق اعلیٰ تعلیم میں داخلے کی شرح صرف دس فیصد ہے جبکہ آدی واسی اور دلت اپنی آبادی کے لحاظ سے صرف 6 سے 7 فیصد تک اعلیٰ تعلیم میں جا پاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دوسرے پچھڑے طبقات (OBC) کی 17 فیصد تک اور مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی کی شرح 5.23 فیصد ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں کی شرح 10.44 فیصد، سکھوں کی 11.2 فیصد، عیسائی اور دیگر مذہبی طبقات کی 18.56 فیصد تک ہے۔ لڑکیوں کی شرح لڑکوں کے مقابلے میں کم ہے۔ لڑکیوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک 8 فیصد ہے جبکہ لڑکوں کی 12 فیصد۔ جن معاشی طبقات کے لوگوں کا داخلہ تعلیم میں انتہائی کم ہے وہ یہ ہیں مزدوروں کا طبقہ، جس کے پاس زمین نہیں ہے یا انتہائی کم ہے۔ دیہات اور شہر کے مزدور طبقے کی تعلیم میں داخلے کی صورتحال انتہائی خراب ہے۔ ان کے داخلے کی شرح فرق 1.41 فیصد اور 3.3 فیصد ہے جبکہ ان کے مقابلے میں جو غریب نہیں ہیں ان کے داخلے کی شرح 13 فیصد ہے۔ دیہات کے غریب 1.3 فیصد مزید کم ہو جاتے ہیں۔ کمزور معاشی طبقات کی رسائی تعلیم تک ناقابل لحاظ ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے پاس زمین نہیں ہے یا پھر وہ انتہائی غریب کسان ہیں۔

سماجی طبقات میں دلت، آدی واسی اور دیگر پچھڑے طبقات، عورتوں اور مسلمانوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک انتہائی کم ہے اور معاشی طبقات میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے یعنی مزدور، بے زمین اور غریب کسان، ان کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک ناقابل ذکر ہے۔ تمام ہی سماجی طبقات کے غریب لوگوں کی حالت انتہائی خراب ہے۔

یہ پوری کہانی ایک خاص طبقاتی صورتحال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دلت، آدی واسی اور دیگر پچھڑے طبقات خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ان کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک کم ہے۔ ان کے ہم مذہب اونچی ذات کے مقابلے میں بطور مثال، دلت ہندو کا داخلہ صرف پانچ فیصد ہے جبکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا 20 فیصد ہے اسی طرح دلت سکھ کا داخلہ 2.33 فیصد ہے اور ان کے مقابلے میں غیر دلت سکھ کا 15 فیصد ہے۔ دلت عیسائیوں کے داخلے کی شرح 7.37 فیصد ہے جبکہ غیر دلت عیسائیوں کا داخلہ 27.52 فیصد ہے۔ اسی طرح ہندو اور عیسائی آدی واسی کا داخلہ بھی غیر آدی واسی ہندو اور عیسائی کے مقابلے میں کم ہے۔ پچھڑی ذات کے ہندوؤں کا داخلہ 7 فیصد ہے جبکہ ان کے مقابلے میں اونچی ذات کے ہندوؤں کا داخلہ 20 فیصد ہے۔ پچھڑی ذات کے مسلمانوں کا داخلہ 3.86 فیصد ہے جبکہ دوسرے مسلمانوں کا 6 فیصد ہے۔

عام طور پر لڑکیوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک کم ہے اور ان میں بھی آدی واسی اور دلت لڑکیوں کی رسائی اور بھی کم ہے۔ یہی حال تقریباً دیگر مذہبی طبقات کا بھی ہے۔

ہندوؤں میں دلت، دیگر پچھڑی ذات اور آدی واسی لڑکیوں کے داخلے کا تناسب بالترتیب 3.93 فیصد، 4.70 فیصد اور 5.57 فیصد ہے۔ ان کے مقابلے میں اعلیٰ ذات کی لڑکیوں کے داخلے کا تناسب 16 فیصد ہے۔ اسی طرح دلت عیسائی لڑکیوں اور آدی واسی عیسائی لڑکیوں کے داخلے کا تناسب بالترتیب 9.57 اور 7.37 فیصد ہے۔ اس کے مقابلے میں اعلیٰ ذات کی عیسائی لڑکیوں کے داخلے کی شرح 27.52 فیصد ہے۔ ٹھیک اسی طرح دلت سکھ لڑکیوں کے داخلے کی صورتحال ہے۔ دلت سکھ لڑکیوں کا داخلہ صرف 2.53 فیصد ہے جب کہ اونچی ذات کی سکھ لڑکیوں کا داخلہ 16.52 فیصد ہے۔ مسلم لڑکیوں کے داخلے کا تناسب دوسرے مذہبی طبقات کی لڑکیوں کے مقابلے میں کم ہے۔ مسلم لڑکیوں کے داخلے کا تناسب صرف 3.74 فیصد ہے۔ ان کے مقابلے میں ہندو لڑکیوں کا 8 فیصد ہے۔ سکھ لڑکیوں کا 11.46 فیصد اور عیسائی لڑکیوں کا 20 فیصد ہے۔ مسلم لڑکیوں میں بھی پچھڑی ذات کی مسلم لڑکیوں کا داخلہ صرف 2.84 فیصد ہے۔

چنانچہ عام طور پر مزدور پیشہ کا داخلہ کم ہے اگر وہ مزدور پیشہ دیہات سے

تعلق رکھتا ہو اور دلت یا آدی واسی ہو تو اس کا داخلہ خاص طور پر کم ہے۔ دیہات کے غیر زرعی مزدور کا داخلہ 3 فیصد ہے اور شہر کے مزدور کا 3.26 فیصد جبکہ ہمارے پاس اسی طبقے کے دلت کا جو جدول ہے اس میں ان کا تناسب 1.52 فیصد ہے۔ غریب طبقے کے مزدور پیشہ آدی واسی، دلت اور پچھڑی ذات کی حالت انتہائی خستہ اور ان کے داخلے کی کیفیت ناقابل لحاظ ہے۔ مزید برآں اس میں ایک فیصد کے حساب سے کمی بھی آرہی ہے۔

یہ واضح ہے کہ دلت، آدی واسی، دیگر پچھڑی ذاتوں، لڑکیوں اور مسلمانوں کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک بہت کم ہے۔ مزدور بے زمین افراد، یا غریب کسان یہ اور بھی زیادہ اعلیٰ تعلیم تک رسائی سے محروم ہیں۔ جن طبقات کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی نہیں ہے اگر ہم ان کا موازنہ ایک وسیع تر تناظر میں ان طبقات سے کریں جن کی رسائی ہے تو اس سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم تک نہ پہنچ پانے کی خاص مجبوریاں ہیں اور وہ ہیں ذات، نسل، جنس یا ان کا مذہبی پس منظر۔ ان کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی کے لیے ضروری ہے ایک ایسی جامع تعلیمی پالیسی کی جو ان مجبور سماجی اور معاشی طبقات کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہو اور جس میں ان کی ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اس میں دو چیزیں خاص طور پر ہوں ایک یہ کہ جن سماجی اور معاشی طبقات کے لوگ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے ہیں ان کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی وضع کی جائے جس میں ان کے ساتھ انصاف ہو اور وہ پالیسی اعلیٰ تعلیم سے محروم طبقات جیسے دلت، آدی واسی، پچھڑی ذات، عورت اور مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یکساں مواقع فراہم کرے جس سے ان طبقات کے افراد مسلسل محروم رہے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی پالیسی غریب حامی ہونی چاہیے تاکہ لوگ غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ ایک غریب حامی جامع تعلیمی پالیسی جس میں مختلف سماجی پس منظر کے لوگ شامل ہوں، خواہ ان کا تعلق کسی ذات، قبیلے، نسل اور مذہب سے ہو اور اس میں ترجیح ان لوگوں کو دی جائے جو مزدور پیشہ ہیں یعنی بے زمین ہیں یا پھر غریب کسان ہیں۔ مختصر آیہ کہ پالیسی منصفانہ ہو اور اس کی تشکیل میں منصفانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ خواہ وہ عوامی ادارے ہوں یا نجی ان میں غریب طبقات کی حصہ داری ہونی چاہیے۔ اس کے لیے تمام طبقات کے غریب لوگوں کے لیے اضافی معاشی تعاون کا طریقہ اپنایا جاسکتا ہے۔

غریب حامی تعلیمی پالیسی کا مطلب ہے کہ وہ تمام طبقات کے غریب لوگوں کے لیے یکساں ہو خواہ ان کا سماجی پس منظر کچھ بھی ہو۔ ایسی جامع تعلیمی پالیسی کو، جس میں معاشی اور سماجی دونوں اعتبار سے کمزور طبقے کا خیال کیا گیا ہو، متعارف کرانے سے پہلے موجودہ تعلیمی پالیسی کو مکمل طور پر ختم کردینا ہوگا۔

(بشکریہ — ہندو، 7 دسمبر 2006)

ترجمہ: سراج احسن

□□□

پتہ:
249-Satlaj Hostel,
JNU, New Delhi-110067

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئر پرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

ٹیکنک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے "جدید۔ ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)

قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

محمد فہیم اختر ندوی

بچوں کی تربیت: آزادی اور پابندی

بچپن انسان کی زندگی کا ایک اہم مرحلہ ہے، کیونکہ بچپن کے نقوش بڑے دیرپا ہوتے ہیں۔ اس عمر میں بچے کی پوشیدہ صلاحیتیں اپنے جوہر کھولنے کے لیے پوری طرح تیار رہتی ہیں اور سیکھنے کی قوتیں سرگرم ہوتی ہیں۔ اس کی آنکھوں کی بصارت اور کانوں کی سماعت، گردوپیش کی ہر نقل وحرکت اور ہر صدا کو دماغ کے خانوں میں محفوظ کرتی جاتی ہے۔ وہ دیکھ کر نقل اتارنے اور سن کر دہرانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس طرح ماحول کے سانچے میں خود کو ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے بچے کے ذہن کو ایک سادہ تختی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح تختی پر جو تحریر لکھی جائے وہی نظر آتی ہے، اسی طرح بچے کا ذہن اپنے گھر اور ماحول میں جو کچھ دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے، اس کے ذہن پر وہ سب نقش ہوتا چلا جاتا ہے لیکن بچے کا ذہن تختی کے برعکس ایک زندہ وجود کا حصہ ہے، اس لیے اس کے ذہن پر تحریر ہونے والے نقوش اس کے کردار میں منتقل ہوتے ہیں، اور اس کے رویے اور عمل میں ان کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

یوں تو بچپن کے یہ نقوش پیدائش کے بعد سے ہی بچے کے ذہن پر ثبت ہونے شروع ہوجاتے ہیں، لیکن جب بچے بولنے اور سمجھنے کے ساتھ شعور کی صلاحیتوں سے آراستہ ہونے لگتے ہیں تو اس میں اچھے اور برے کی تمیز آنے لگتی ہے، اس کے ذہن میں سوالات اٹھتے ہیں اور گردوپیش میں وقوع پذیر ہونے والی چیزوں کے بارے میں اس کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے۔ کچھ آگے آکر بچے میں کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوتا ہے، وہ سمعی اور بصری وسائل کا استعمال کرکے اپنی معلومات میں اضافہ اور شوق کی تکمیل کرتا ہے، اس میں ترکیز (Concentration) کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ کسی واقعے، مشاہدے یا مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز کرکے اس کے بارے میں اپنی پسند اور ناپسندیدگی طے کرتا ہے۔ اس مرحلے پر بچے کے سرپرست اور نگراں کا رول بڑا اہم اور نازک ہوجاتا ہے۔ بچے اپنے والدین، بھائی بہن اور اعزہ واقارب سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ان کی سوچ، بول چال، رہن سہن، کھانا پینا اور اخلاقی رویے اس کے لیے آئیڈیل بنتے ہیں۔ اس مرحلے میں درس گاہوں اور اسکولوں کا ماحول بھی بچے کے ذہن وکردار پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔

بچوں کی تربیت کے دو بنیادی عنصر پابندی اور آزادی ہیں۔ جس طرح مکمل آزادی بچے کو بے راہ بنا سکتی ہے، اسی طرح صرف پابندی بچے کی شخصیت کے نکھار اور اٹھان میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اچھی تربیت کے لیے آزادی اور پابندی دونوں ضروری ہیں۔ لیکن اہم ترین سوال یہ ہے کہ بچے کو کن امور میں آزادی دی جائے اور کس حد تک؟ اسی سوال کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بچے پر کن باتوں کی پابندی ہو اور کس حد تک؟ اس سوال پر سرپرستوں اور والدین کی رائیں الگ الگ ہوسکتی ہیں۔ ان کی اپنی پسند اور ترجیح کا فرق ہوگا۔ اس سلسلے میں معتدل رویہ یہ ہوگا کہ دو بنیادی پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جائے:

اول یہ کہ بچوں پر صرف بنیادی اخلاقی باتوں کی پابندی ہو اور اس دائرے میں رہتے ہوئے انھیں اپنے دماغ اور ذہن کو استعمال کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔ مثال کے طور پر بچوں کے ایسے اوقات کار بنائے جائیں جو موٹے موٹے کاموں سے متعلق ہوں، جیسے پڑھائی کے اوقات، کھیل کے اوقات، ٹہلنے اور گھومنے کے اوقات، مسلمان بچوں کے لیے نماز اور تلاوت قرآن کا معمول وغیرہ۔ اسی طرح اسکول کے کام، خارجی مطالعہ، اپنی پسند اور ذوق کے مطابق کچھ آزادانہ کام خواہ وہ کچھ ٹیکنکل قسم کا ہو یا تخلیقی نوعیت کا، چھٹی کے دنوں کے لیے کام، خواہ وہ گھر میں سجاوٹ اور صفائی، دینی پروگراموں میں شرکت ہو یا محلے پڑوس کے لیے سماجی نوعیت کے اصلاحی کام اور علمی وتعلیمی سرگرمیاں، عزیزوں اور بزرگوں سے ملاقات، لائبریری اور تاریخی جگہوں کی سیر وغیرہ۔ اس طرح بچوں کے ذوق کے لحاظ سے ان کے لیے اوقات عمل طے کیے جائیں، اور کوشش کی جائے کہ بچہ بتدریج اپنے اوقات کار کا پابند ہوتا جائے۔ اوقات کار بنا دینے کے بعد، انھیں پوری آزادی دی جائے کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیت، پسند اور سوچ کے مطابق اپنے کام کو انجام دیں۔ دور سے نگرانی ضرور کی جائے، لیکن تفصیلی طور پر ہر چھوٹے چھوٹے کام کی تعیین، اس کے انجام دینے کا طریقہ اور اس کے ڈھنگ میں اپنی سوچ بچوں پر نہ تھوپی جائے۔ بچوں کو اپنے طور پر کام کرنے کی نہ صرف آزادی دی جائے بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کی جائے۔ انھیں ان کی ضرورت کا سامان اور وسائل بھی حسب صلاحیت فراہم کیے جائیں۔ انھیں غلطی کرنے دی جائے، پھر مناسب موقع پر مناسب انداز سے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے۔ مقررہ نظام العمل کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادی بچوں کو بتدریج ایسی قابلیت سے آراستہ کرے گی کہ وہ اپنے کاموں کو نظم وضبط اور ذمہ دارانہ جذبے کے ساتھ اچھے سے اچھے طریقے پر انجام دے سکیں گے۔ پھر ان کا ذہنی افق وسیع ہوگا اور ان کے کاموں میں جدت، حسن اور معیار کا احساس ہونے لگے گا۔

یہ ضروری ہے کہ بچوں کو کسی بھی نظام العمل کا پابند بنانے میں بہت زیادہ سختی نہ برتی جائے۔ بچپن کے دن سیکھنے کے ہوتے ہیں، اس عمر میں بچے بہت سارے تجربات کرتے ہیں، وہ باتوں کو ٹالنے اور حکم کو توڑنے کا بھی تجربہ کرتے ہیں، وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس چیز کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟ اگر ایسی کچی عمر میں بچوں پر سختی کی جائے تو ان کے اندر خوف سمانے لگتا ہے، وہ آزادانہ طور پر کچھ کرنے کی بجائے چوری چھپے اپنی پسند کا کام کرنے کا راستہ ڈھونڈنے لگتے ہیں، اس سے ان کی صلاحیت ابھرنے نہیں پاتی۔ اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان کے اندر اپنے نظام العمل کے مطابق کام کرنے کا شوق پیدا ہو اور وہ از خود کسی کام کو انجام دینے میں خوشی محسوس کریں۔ صرف ڈر اور خوف کا دباؤ اگر انھیں نظام العمل کی پابندی کرائے گا تو ایسی صورت میں یا تو کچھ دنوں کے بعد ڈر اور خوف ہی جاتا رہے گا اور سارا نظام العمل درہم برہم ہو جائے گا، یا پھر جب بھی بچہ اس خوف کے ماحول سے دور ہوگا، یا جہاں اس پر ایسے کسی خوف کا دباؤ نہیں ہوگا تو وہ ایک دم سے خود کو آزاد محسوس کرتے ہوئے ساری حدود کو پار کر جائے گا اور ایک بدلے ماحول میں خود کو پاتے ہوئے صحیح وغلط کی تمیز کھو بیٹھے گا۔ یہ صورت حال بچے کے لیے بہت تباہ کن ہوگی۔ اس لیے نرمی اور ڈھیلے ڈھالے رویے کے ساتھ بچوں کو ان کے مقوضہ کاموں کی راہ پر لانا مفید ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ ان کی دلچسپی کا لحاظ رکھا جائے، اور حکمت و تدبر کے ساتھ ان کی پسند اور شوق کا رخ اچھی عادتوں، اچھے کاموں اور مفید مقاصد کی جانب موڑا جائے۔

آزادی اور پابندی کا جامع منصوبہ بچوں کی تربیت کا ایک بہتر نظام ہوگا، اور بچوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور سیرت و کردار کو بہتر بنانے کے پورے مواقع ملیں گے۔

موجودہ زمانے میں بچوں کی تعلیم اور تربیت کے بہتیرے منصوبے بنائے جارہے ہیں، ان کی علمی لیاقت اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے نئے نئے پروگرام اور سرگرمیاں پیدا کی جارہی ہیں، اس مقصد کے لیے نئے نئے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جارہا ہے اور بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جارہی ہیں۔ یہ رجحان کئی اعتبار سے قابل ستائش ہے لیکن اس پورے منظرنامے میں جس چیز کی بڑی شدت سے کمی محسوس ہورہی ہے وہ سیرت و کردار کی تربیت کا پہلو ہے۔ اچھے اچھے تعلیمی اداروں اور اسکولوں میں اچھی علمی لیاقت رکھنے والے بچے سیرت و کردار کے اعتبار سے انتہائی شرمناک رویوں کے حامل بن رہے ہیں۔ اخلاقی بے راہ روی، جنسی انارکی، ظلم وتشدد، بدتمیزی و بے تہذیبی، اور اعلیٰ انسانی قدروں کے تئیں عدم احترام جیسی خرابیاں اب ہمارے نونہالوں میں عام ہوتی جارہی ہیں۔ انسانیت دشمن رویے بھی سامنے آرہے ہیں۔ یہ صورت حال اس لیے پیش آرہی ہے کہ تعلیم گاہوں اور گھروں میں اخلاقی تربیت کا پہلو نظرانداز کردیا گیا ہے جو انسانی کردار کی تعمیر وتشکیل کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر آج مختلف حلقوں کی جانب سے اقدار کی تعلیم (Value Education) کو نصاب میں شامل کرنے کی بات کہی جارہی ہے، اس کی اہمیت عمومی تعلیم کے مساوی ہی نہیں بلکہ کئی اعتبار سے اس سے زیادہ ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt of Islamiyat,
Molana Azad National Urdu University,
Hyderabad

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

رابعہ سرفراز

سندھ میں اردو

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں دیگر نظریات کی طرح ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اردو کی جنم بھومی سندھ ہے۔ اس نظریے کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا سندھ کے علاقے سے ہوئی۔ ہدایت علی تارک کی کتاب ''تاریخ شعرائے اردو'' میں پہلی مرتبہ یہ حوالہ آیا ہے۔ محمد حفیظ الدین حفیظ نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جو 1945 میں شائع ہوا۔ جن محققین کا یہ کہنا ہے کہ اردو کی پیدائش سندھ میں ہوئی ان میں افسر امروہی'' مولانا حبیب اللہ خاں شیروانی اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی شامل ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خیال میں سندھ میں اردو کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اپنی کتاب ''نقوش سلیمانی'' میں لکھتے ہیں کہ سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ ہے۔ عربی اور سندھی کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود میں آئی اور باہر سے آنے والے لوگ سندھ کی تہذیب سے متاثر ہوئے اس لیے انھوں نے جو بھی کتابیں لکھیں ان میں سندھ کا حوالہ دیا گیا۔

رشید احمد لاشاری اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ وہ اردو ہے جو اہلِ عرب سے سندھ میں آئی
بڑھی ملتان میں اور پرورش لاہور میں پائی
اسے تقدیر لکھنؤ سے اٹھا کر دہلی میں لائی
غرض مشرق سے مغرب تک ہوئے سب اس کے شیدائی
یہی تو شانِ اردو ہے کہ اس کو سب سے الفت ہے
نہ پنجابی کی دشمن ہے نہ سندھی سے عداوت ہے

مسلمانوں کی سندھ میں آمد نے سندھی زبان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ شمس شیراز کی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' میں اردو زبان کا پہلا فقرہ ملتا ہے جو یہ ہے: برکت شیخ پٹھا، اِک موا اِک نٹھا

712 عیسوی میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی اور سندھ اور ملتان کے علاقوں کو فتح کیا۔ اس فتح نے سندھ پر اچھے اثرات مرتب کیے اور فاتح اور مفتوح ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔

سید سلیمان ندوی کے خیال میں ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولی اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ موجودہ اردو انھی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز انھی بولیوں میں عربی اور فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی۔''

سید حسام الدین راشدی کے خیال میں اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی وہ مشترک زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزارہا الفاظ زبانوں میں شامل ہوگئے اور اہلِ ہند ہندو ہوں یا مسلمان انھیں سمجھنے اور بولنے لگے۔

سندھ میں مغلوں کی آمد سے پہلے بھی اردو زبان کے فروغ کے لیے کافی کام ہوا اور سندھ میں آہستہ آہستہ اردو زبان کا دبستان تشکیل ہوا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی کتاب ''سندھ میں اردو شاعری'' میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے مغلیہ دور کے 3، کلہوڑہ دور کے 5، تالپور دور کے 61 اور برطانوی دور کے 46 شعرا کا ذکر ملتا ہے جو تمام کے تمام سندھ سے تعلق رکھتے تھے اور کہیں باہر سے نہیں آئے تھے۔ ان کے علاوہ سندھ میں چند ایسے شعرا بھی تھے جن کا تعلق سندھ سے نہیں تھا بلکہ وہ دوسرے علاقوں سے سندھ میں آئے تھے۔

143 ہجری سے 1173 ہجری کے دوران میں سندھ میں اردو کے پچاس سے زائد شعرا کا پتا چلتا ہے۔ یہ تعداد میر شیر علی قانع نے اپنی کتاب ''مقالات الشعرا'' میں بیان کی ہے۔ ایک دوسرا اہم تذکرہ جس سے ہمیں سندھ میں اردو شعرا کا حال معلوم ہوتا ہے مخدوم ابراہیم کا ''تکمیل مقالات الشعرا'' ہے۔ اس میں سندھ کے 38 شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔

سندھ میں چودھویں صدی عیسوی میں ادب اور شاعری نے بہت ترقی کی۔ ان میں ملا عبدالحکیم شطاری کو سندھ میں اردو زبان کا ولی دکنی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مری صدرالدین کامل، میر محمود ساغر، سید ثابت علی شاہ، بچل سرمست، میر غلام علی مائل، میر محمد نصیر، خان جعفری اور قادری بخش بے دل کے نام ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سندھ میں اردو کی آبیاری صرف اہلِ سندھ نے ہی نہیں کی بلکہ سندھ میں موجود غیر ملکی حاکم بھی اردو کی اہمیت سے واقف تھے۔ 1843 میں جب سندھ انگریزی مقبوضات میں شامل کیا گیا تو تلاش معاش کی خاطر یو. پی اور پنجاب کے اردو داں حضرات سندھ آئے۔ اس طرح اردو نے مقامی زبان سندھی کے ساتھ اپنے دائرۂ اثر کو وسعت دینا شروع کی۔ سندھی کو دفتری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی لیکن کراچی کی عام زبان ہونے کا شرف

اردو کو حاصل ہوا۔

1820 میں کراچی سے اردو اخبار ''دوربین'' کا اجرا ہوا۔ اس اخبار کے مدیر مرزا محمد جعفر تھے۔ یہ سندھ میں اردو کا پہلا اخبار تھا۔ 1893 میں سندھی روزنامہ ''آفتاب سندھ'' کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اس اخبار میں اردو نظمیں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ ہفت روزہ اخبارات میں 1882 میں کراچی سے ''معاون مجمع محمدی'' کا اجرا ہوا۔ اس میں اردو مضامین اور اردو شعرا کا کلام شامل ہوتا تھا۔ یہ اردو کا پہلا ہفت روزہ تھا۔ سندھ کا پہلا پندرہ روزہ اخبار ''چترکار'' کراچی سے 1947 میں شائع ہوا اور اس میں اردو کے لیے دو صفحات مختص کیے گئے۔

پہلا ادبی ماہنامہ ''تنویر'' 1934 میں شائع ہوا تھا۔ عام اشاعتوں کے علاوہ 1939 تک اس نے حالی نمبر، اقبال نمبر، شعر وسخن نمبر اور سندھ پر اونٹل نمبر، وغیرہ شائع کیے۔ اردو کانفرنس نمبر اور مصطفیٰ نمبر بھی شائع کیے۔ ''سندھ مدرسہ کرانیکل'' پہلا سہ ماہی، علمی اور ادبی رسالہ تھا۔ یہ ابتدا میں انگریزی اور سندھی میں شائع ہوتا تھا لیکن بعد میں 1930 سے اس میں حصۂ اردو کا اضافہ کردیا گیا تھا۔ سندھ میں اردو نثر کی ابتدا بھگوت گیتا کے ترجمے سے ہوئی۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے۔ طبع زاد کتابوں میں میر محمد علی حسن کی ''احسن البیان'' پہلی کتاب ہے جو 1820 میں شائع ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد طب مہاجرین کی آمد ہوئی تو تھوڑے ہی عرصے میں اردو سندھ کے طول وعرض میں بولی جانے لگی اور آج اہل سندھ اسے مکمل طور پر اپنا چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کا قیام 1903 میں عمل میں آیا لیکن 1907 تک صوبائی شاخوں کے قیام کی تجویز کسی کے ذہن میں نہ آئی۔ 1914 میں ماسٹر ولایت حسین کی تحریک سے سندھ میں انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ کا قیام عمل میں آیا، اس شاخ نے 17 مئی 1924 کو ایک کتب خانہ قائم کیا جس میں 1939 کے اواخر تک دو ہزار سے زائد کتب موجود تھیں۔ انجمن ترقی اردو نے مشاعروں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ پہلا مشاعرہ 1914 میں ہوا پھر 1915 سے 1919 تک ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ مشاعرے ہوتے رہے۔ 1906 میں خیرپور میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت منشی محبوب عالم مدیر ''پیسہ'' اخبار نے کی اور اس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ 1964 میں حیدرآباد سندھ میں اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ 1965 سے 1968 تک اٹھارہ مشاعرے منعقد ہوئے۔ یہ اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ اردو برصغیر کے ہر علاقے کے ساتھ ساتھ سندھ کی عوامی زبان بھی ہے اور علمی اور ادبی زبان بھی۔ جناب آئی آئی قاضی کے بقول اردو بین الاقوامیت کی علامت ہے۔ یہ زبان دنیا کی تین تہذیبوں یعنی، ہند آریائی' سامی اور منگول تہذیبوں کا سنگم ہے۔ آج کراچی، حیدرآباد اور سکھر اردو کے اہم مراکز ہیں۔

اگرچہ اردو زبان کی ابتدا سندھ سے بہت پہلے پنجاب اور ہندوستان کے شمالی علاقوں سے ہوچکی تھی لیکن اردو کے فروغ اور ارتقا میں سندھ اور اہل سندھ کی اہمیت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu,
G.C. University,
Faisal Abad, Pakistan

مسدود راہیں

ترجمہ وتعارف — زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ وتعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لاکر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار ورموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

حمایت علی شاعر

خط اور غزل

15 جون 2007

بھائی مخمور سعیدی صاحب، محبت بھرا اسلام قبول کریں۔

عرصۂ دراز کے بعد تم سے یوں ملاقات ہوئی کہ ایک صاحب نے پونہ سے آپ کے رسالے ''اردو دنیا'' کا ایک شمارہ بھیج دیا۔ اس میں ڈاکٹر اسپیڈ کر کے بارے میں ان کا مضمون تھا۔ غالباً یہ صاحب مجھے پچھلے دنوں پونہ کے مشاعرے میں ملے تھے۔ یہ بات میں اندازے سے لکھ رہا ہوں اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ یاد بھی نہیں رہتا۔ ایک آدھ ملاقات کہاں یاد رہتی ہے۔ خیر، میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اس بہانے تم تو سامنے آ گئے۔۔۔ تصور میں تمھیں دیکھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں۔ ہائے، کیسے دن ہم لوگوں نے گزارے تھے، بھلائے نہیں بھولتے۔ مگر اب تو جی چاہتا ہے کہ وہ سب دن ساتھ رہیں زندگی کے سرمائے کی طرح۔۔۔ خیر، بتاؤ، کیسے ہو، صحت تو اچھی ہے نا۔ بہت دنوں سے کوئی تحریر بھی نظر سے نہیں گزری۔ میں سرشنکر لال کے مشاعرۂ دہلی کا تھوہل میں 6 یا 7 اپریل کو آیا تھا۔ پھر اورنگ آباد چلا گیا۔ اپنے آبائی شہر، 9 سال بعد آنا نصیب ہوا تھا۔ حیدرآباد میں عالمی اردو کانفرنس تھی نا، اس میں یار لوگوں نے یاد کر لیا تھا۔ کچھ احباب سے ملاقات ہوئی۔ یہ کانفرنس 10,11,12 مارچ کو ہوئی۔ دہلی کا مشاعرہ 6 یا 7 اپریل کو تھا۔ ایک ماہ اورنگ آباد میں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ رہنے کا موقع مل گیا۔

بھائی کچھ اور نہ سہی رسالہ ''اردو دنیا'' ہی بھیج دیا کرو اس طرح قرب کا احساس رہتا ہے۔ کہو تو کبھی کچھ لکھ بھی دیا کروں گا۔ آپ کی کوئی نئی کتاب؟ (پرانی کتابیں کون سی دیکھیں جو اس کی آرزو کر رہا ہوں) ہم لوگ واقعی بہت دور ہو گئے ہیں۔ دہلی کی وہ محفلیں یاد آتی ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحثیں کرتے تھے، کبھی لڑ بھی لیتے تھے، پھر گلے مل جاتے تھے۔ تم سے تو شاید کبھی لڑائی ہی نہیں ہوئی، تم سے صرف محبت ہی کی جا سکتی ہے۔ اسی محبت کے جذبے سے تمھیں آج خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس شمارے میں ڈاکٹر علی جاوید پر تمھارا ایک تعارفی مضمون پڑھا۔ جعفر زٹلی کے تعلق سے ان کا صرف نام جانتا تھا کہ انھوں نے اس پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ غالباً پی ایچ ڈی کے لیے۔ تمھارے مضمون سے اور باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ یہ تو بڑے لائق آدمی ہیں۔ خلیق انجم نے بھی تعریف کی ہے۔ کاش ہمارے ملکوں میں کتابوں اور رسالوں کی ترسیل میں آسانی ہوتی۔ کیسے کیسے گہر ہائے آبدار آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اچھا یار، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ احباب کو سلام کہنا۔ علی جاوید صاحب کو بھی۔ رسالے کے لالچ میں ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ اور کیا کہوں۔

تمھارا

حمایت علی شاعر

آئینہ در آئینہ

اس بار وہ ملا تو عجب اس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی
اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں
اک جسم تھا کہ روح سے مصروفِ جنگ تھا

میں نے کہا کہ یار تجھے کیا ہوا ہے یہ
اُس نے کہا کہ عمر رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمر رواں تو سبھی کی ہے
اُس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں
اس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ

دیکھا، تو میرا اپنا ہی عکسِ جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

□□□

C.B. 45, Falah Society,
Shah Faisal Colony, Karachi-75230 (Pakistan)

ہرشد جرویدی

قسمت

سب کہتے ہیں میں گذشتہ چھ ماہ سے بے ہوش ہوں۔ ڈاکٹروں کی کوئی تدبیر کام نہیں کر رہی ہے اور میری عادت کے لیے آنے والوں کی بھیڑ میرے پلنگ کی چاروں طرف گیدھوں کی طرح جمع ہوتی رہتی ہے۔ ایک کے بعد ایک آتے، پنکھ پھیلاتے، لمبی گردن اونچی کرتے، کرخت آواز نکالتے، پھر دور جیسے کچھ دیکھ لیا ہو، اس طرح خوش ہو جاتے۔ میرے پاس آنے کے لیے آپس میں آپا دھاپی کرتے۔ مشورے دینے کا مقابلہ..... کوئی کہتا اس کے تو ناخن میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی، اب بے چارہ کس قدر بے بس ہو گیا ہے۔ جدید ادویات سے لے کر تنتر منتر، تعویذ، منتوں کے چونچلے..... وشاکھا سب کو غور سے سنتی۔ مشورے دینے والے جانے کے بعد سب بھول جاتے۔ ابھی ابھی کسی نے مجھے میراں داتار لیجانے کی بات کہی۔ مجھے لے جانا ممکن نہ ہو تو وشاکھا اکیلی بھی جا کر آسکتی ہے۔ اب شاید ان ساری باتوں میں وشاکھا کی شردھا ہو بھی، لیکن وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھے کسی کے بھروسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ گزر گئے۔ کلینڈر جیسے تھم گیا ہے۔ ملنے آنے والوں میں کچھ لوگ زیادہ ہی حساس ہیں۔ وہ مجھ پر رحم کا اظہار کرنے کے بجائے وشاکھا سے زیادہ ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سب میرے سامنے ہی کہتے ہیں، ''وشاکھا تم تو اپنا دھیان رکھنا ہی بھول گئی ہو! دیکھو تو کیسی ہو گئی ہے۔ اس کی بیماری کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ جب ڈاکٹروں نے ہی ہاتھ اٹھا لیے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم دن رات یہاں پڑی رہو گی تو وہ ہوش میں تو نہیں آجائے گا؟ تمھیں بھی تو اپنی زندگی جینا ہے کہ نہیں؟ کچھ نہیں تو دو چار دن کے لیے گھر چلی جاؤ۔ گھر نہ جانے کس حالت میں ہوگا؟ گھر نہیں تو پاپا کے ہاں..... تھوڑی طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔'' باہر نکلتے ہوئے، پرارتھنا بھی کرتے جاتے ہیں۔ ''بے چارے کو بھگوان..... '' لیکن یہ کوئی دعا گا تو نہیں ہے جو توڑ دیا جائے۔ گذشتہ ایک ماہ سے آنے والوں کی بھیڑ کچھ کم ہوئی ہے۔ آنے والے ایک بار آئیں گے، دو بار آئیں گے، پھر.....؟

وشاکھا جانے کب سے بیٹھی رسالے کے اوراق پلٹ رہی ہے۔ کبھی کبھی کھڑکی سے باہر دیکھ لیتی ہے۔ اچانک ایک پرندے نے لمبی سیٹی سی بجائی۔ وشاکھا چونک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر اشوک کا درخت جھوم رہا ہے۔ ہوا سے ادھر سے ادھر۔ پل بھر کے لیے اس کی آنکھیں پرندے کو دیکھنا بھول کر اشوک میں کھو گئیں۔ میں اس سے کہنے کے لیے بے چین ہوا تھا ہوں، ''ارے، یہ تو وہی پرندہ..... بھول گئی؟ اس دن شام کو میں نے تمھیں بتایا تھا.....'' لیکن اپنے ہونٹوں پر میرا بس نہیں ہے۔ مجھے لگا تھا کہ وشاکھا ابھی پوچھ بیٹھے گی ''ہے، یہ کس کی آواز ہے؟'' لیکن ایسی غلطی کرنے کی کیفیت سے وہ کب کی نکل چکی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ جواب نہیں ملے گا۔ میرے پلنگ کی بغل میں میز پر رکھے تھرمس پر کھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ ''وشاکھا سن رہی ہو؟ دیکھو نا، یہ کس قدر گندہ لگ رہا ہے۔'' وشاکھا کیسے سنتی۔ شروع کے ایک مہینے کی بات الگ تھی۔ اب تو اسے بھی یاد نہیں ہوگا کہ مجھے کیا پسند ہے کیا نہیں۔

ابھی نرس آکر پوچھ گئی، ''جوس دے دیا؟'' وشاکھا نے بے جان پاؤں کھڑے ہو کر جمہائی لی ایک انگڑائی کے ساتھ، میری خواہش ہوئی کہ میرے سر پر ہاتھ پھیر دے تو اچھا، لیکن وہ تو سیدھی میز کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی نظر تھرمس پر پڑی۔ لڑکھڑاتی چال سے واش بیسن کی جانب مڑی۔ کہنیا دینے والی تل کی تیز آواز۔ اس نے تل دھیما کیا، تھرمس دھویا۔ تل کھلا چھوڑ کر ہی وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ تھوڑا سا واشنگ پاؤڈر لے کر واپس تل کے پاس چلی گئی۔ فرش پر کتنی ساری بوندیں یہاں وہاں بکھریں۔ لگتا ہے یہ وشاکھا سے ہی نہیں۔ میں اسے ٹوکوں گا۔ اب تو وہ ڈرتی بھی نہیں رہا ہوگا۔ تھرمس صاف کر میز پر الٹا رکھ دیا۔ ہزار بار سمجھایا ہے کہ اس طرح الٹا نہیں رکھتے، تھوڑا سا ٹیڑھا کر کے دیوار سے لگا کر رکھنا چاہیے نہیں تو بکیوم ہوتا ہے اور اندر کا کانچ چٹخ جاتا ہے۔ دیکیوم تو میرے اندر بھی ہو گیا ہے، لیکن .....!

بغل والے کمرے میں فریج ہے۔ وشاکھا فریج میں رکھا جوس نکال کر لے آئی۔ یخ سرد دینے کے لیے ڈاکٹر نے منع کیا ہے، اس لیے تھوڑی دیر میز پر ہی رکھے گی لیکن میرا قیاس بالکل غلط تھا۔ اس نے تو یہ انجانی سرنج، دھیرے دھیرے پچکاری جیسا بڑا انجکشن بھر کر، میری ناک میں لگی نلی کے ذریعے میرے جسم میں دھیرے دھیرے..... ہوں ..... اب کچھ راحت ملی۔ میں جوس کے ذائقے کا تصور کرتا ہوں، لیکن گلے میں بلغم بھر گیا ہے۔ جوس کبھی ترش تو نہیں ہوتا۔ آج کل میری بیماری نے وشاکھا کو بالکل گاؤدی بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ پسی ہوئی شکر کے بدلے نمک یا فلفری ڈال دی ہو لیکن ڈاکٹر نے کہاں مجھے منع کیا ہے شکر کے لیے جو فکر کی جائے۔ انجکشن پر دباؤ دینے کی وجہ سے وشاکھا کا انگوٹھا سرخ ہو گیا ہے۔ کچھ بوریت کے ساتھ اس نے سرنج ٹھکانے پر رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ معلوم نہیں اچانک کیا ہوا۔ وہ آکر میرے سرہانے بیٹھ گئی اور رفتہ رفتہ میرے بالوں کی لٹوں کو الگ الگ کرتے

ہوئے ایک دائرے میں گھمانے لگی۔ میں کندھوں پر اس کی جانگھوں کا لمس محسوس کرتا ہوں۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں میں جس طرح سے گھوم رہی ہیں...... گذشتہ چھ سات مہینوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وشا کھا تمھاری خواہشیں میرے دل تک پہنچ رہی ہیں، لیکن لاچار ہوں، کیا کروں؟ حالانکہ وہ بھی یہ جانتی ہے۔ کہتا ہوں— چھوڑ دو مجھے، وشا کھا! اس ہسپتال کے بھروسے اور گھر چلی جاؤ...... کب تک گھڑی کے پنڈولم کی طرح ...... خواہش ہوئی کہ اسے بانہوں میں بھینچ لوں، لیکن ابھی تو وہ خود اپنی خواہشوں کو مارنے میں لگی ہے، تب میری خواہشیں اس تک کیسے پہنچ سکتی ہیں؟

وشا کھا کھڑی ہوگئی۔ شاید اسے ٹھنڈ لگی ہوگی، پنکھے کی رفتار کم کی۔ مجھے چادر اوڑھا دی۔ منہ کھلا رکھا، اسے اتنا تو یاد ہے کہ میں کبھی منہ ڈھانپ کر نہیں سوتا، لیکن آج نہیں تو کل اسے ہی مجھے چادر اوڑھانا پڑے گی، منہ ڈھانپ کر...... ! ہاں، اسے ہی۔ ابھی کل ہی تو ڈاکٹر کہہ رہے تھے، ''اپنے جسم پر کنٹرول نہیں ہے لیکن حسیّتیں بیدار ہیں۔ جب تک دواؤں کا اثر ہوتا رہے گا تب تک کوئی پیچیدگی نہیں ہوگی۔ ہماری کوشش یہی ہے کہ ...... دماغ جلد سے جلد......'' کہتے ہوئے اس نے میرے پیر کے تلوے پر پین دبایا۔ میرا پیر کانپا لیکن میں پیر کھینچ نہ سکا۔ ڈاکٹر نے ہونٹ دبائے۔

وشا کھا مجھے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ شاید پہلی بار اس کی آنکھوں میں رحم کی جگہ پر مستقبل کی فکر دکھائی دی۔ وقت کی بات ہے مجھے کچھ ہوگیا تو بھی اسے معاشی طور پر کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اپنا مکان ہے، بھلے ہی بیمہ کمپنی کے قرض پر۔ میری موت کے ساتھ ہی قسط بند۔ مکان پوری طرح سے اس کا۔ اس کے بعد بھی کم از کم دو ڈھائی لاکھ تو اسے ملیں گے ہی اور ہاں...... گریچوٹی فنڈ کے کم سے کم گنو تو بھی ڈیڑھ لاکھ تو ہوں گے ہی، ساتھ میں ہر ماہ دو، ایک ہزار پنشن۔ اسے کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ویسے تو ان چھ مہینوں میں ہی اس کی کمر ٹوٹ جاتی، لیکن ہسپتال اور دوا کا سارا خرچ سرکار دے رہی ہے۔ بل پاس ہونے میں دیر سویر ہوتی ہے، پھر بھی 'کل کیا کریں گے؟' ایسی حالت نہیں ہوئی۔

اب لگ رہا ہے کہ وشا کھا نے اگر پانچ سال تک 'انجائے' کرنے کی ضد نہ کی ہوتی تو آج گھر میں ایک بچہ بھی ہوتا۔ کتنا اچھا ہوتا، اس کے سہارے وہ جی لیتی۔ لیکن ...... لیکن کیا...... ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ اولاد نہیں ہے ورنہ اس طرح دن رات وہ میرے پاس کیسے رہتی؟ بچے کو اسکول بھیجنے سے لے کر ہزار مصیبتیں...... لیکن میں ابھی کہاں مرگیا ہوں جو اتنا زیادہ سوچ رہا ہوں۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کیا پتہ، کل شاید کسی دوا کا اثر ہوجائے...... لیکن نہیں...... ڈاکٹر کہتے ہیں ایسے امکان تو نہیں...... مریض پانچ دس سال تک ہی اس طرح بے ہوش رہ سکتا ہے...... اور کچھ نہ ہو تو موت نہیں ہوتی۔ باقی تو ڈاکٹر ہی سچے ہیں کہ ''کچھ نہیں ہوتا!''

تو کیا یہی میرا مقدر ہے؟ 'وشا کھا، ابھی تو صرف پینتیس سال عمر ہے تمھاری...... اپنا مستقبل برباد مت کرو۔ کوئی اچھا آدمی دیکھ کر...... مجھے چھوڑ دو اپنی قسمت پر، اتنا کہنے لائق ہوش میں آجاؤں تو بھی کافی ہے۔ ایک بار میں نے بالکل پاس جا کر اس کے کان میں کہا تھا،' وشا کھا، تمھارے بغیر ایک سانس بھی......'' کہیں وہ اس بات کو یاد رکھ کر تو نہیں جی رہی ہوگی؟ دو سال پہلے میں سرکاری کام سے تین دن کے لیے باہر گیا تھا، تب وہ کیسی باولی ہوگئی تھی۔ کہتی تھی بڑی مشکل سے نکلے یہ تین دن۔ اس رات برستے پانی کے ساتھ ہم بھی کیسے برس پڑے تھے۔ یہ وہی وشا کھا ہے۔ چھ مہینوں میں اس کی شکل ہی بدل گئی ہے۔ ابھی وہ گہری نیند میں سو رہی ہے۔ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوگی۔ اچانک چیخ کر جاگ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ اسے کوئی اچھا خواب آیا ہوگا۔ اس خواب کے بعد تو اسے ہمیشہ ایسے ہی چیختے رہنا ہوگا نا؟ اس سے تو اچھا...... کیا اچھا، گھٹن بے چینی؟

ایک لمحے کے لیے میں بھول جاتا ہوں کہ یہ ہسپتال کی کھڑکی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اپنے گھر کی کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوں۔ باہر اشوک کے دو درخت لہرا رہے ہیں۔ ایک چڑیا اس میں بار بار جاتی ہے، پھر تھوڑی دیر میں ہوا میں منڈراتے ہوئے اڑ جاتی ہے، شاید اس میں اس کا گھونسلا ہے۔ وشا کھا بھی اسی طرح اڑتی رہتی تھی۔ آج گھمنڈ تو کل کھانڈوی۔ کچھ نہ کچھ نیا بناتی رہتی۔ میں کھانڈوی نام بار بار بھول جاتا تو وہ کہتی، ''اسے ہانڈوا کی بہو کہتے ہیں۔ کھانڈوی......'' میں کھانڈوی کا ایک رول منہ میں رکھ کر وشا کھا کی گردن کو دھیرے سے سہلاتا۔ آج میرا ہاتھ بہرہ گونگا ہوگیا ہے۔ ہاتھ کیا، میں ہی پورا بہرہ گونگا...... سوکھے درخت میں کسی شاخ کے پھوٹنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر بھلے ہی اس شاخ کے پتے پتے پر موت کا پیغام ہو۔ وشا کھا بھی اس سوکھے درخت کے ساتھ سوکھ گئی ہے۔ چھ مہینے سے مسرت کیا ہے، اس کا بھی اسے علم نہیں ہے۔ اب تو اسے وقت کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی ہے۔

اچانک دھوپ نکل آئی ہے۔ دھوپ سیدھے میرے منہ پر پڑ رہی ہے۔ کہیں وشا کھا جاگ نہ جائے۔ نہیں تو دھوپ دیکھتے ہی کھڑکی بند کردے گی۔ اسے کون بتائے گا کہ مجھے دھوپ اچھی لگ رہی ہے، کھڑکی کھلی رہنے دو، لیکن اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کہاں رہ گئی؟ دھوپ کو بادل نگل گئے۔ کب سے ان کا کھیل چل رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں لگتا ہے کہ ابھی برسات ہوگی...... اور پھر اچانک تپتی ہوئی دھوپ۔ میرے ہاتھ پاؤں کھنچ کیوں رہے ہیں؟ ساری نسیں تن رہی ہیں...... روح چھٹ پٹا رہی ہے۔ شاید قے کے ساتھ جان نکل جائے گی...... لیکن ایسا اچانک کیوں؟ ہوں...... جوس کا وقت ہوگیا ہے۔ کوئی جلدی مجھے...... میں...... لگ رہا ہے میں پورا کا پورا اچھل رہا ہوں...... ہاتھ پاؤں کانپ

رہے ہیں۔ کہہ رہا ہوں، ''کوئی مجھے...... وشاکھا کہاں گئیں؟ سونا چھوڑو...... جلدی دو مجھے...... میں لاچار نہیں ہوتا تو کہاں کبھی کچھ مانگتا؟'' میرے گلے کی گھرگھراہٹ سن کر ایک وارڈ بوائے دوڑتا ہوا آیا۔ مجھ پر نگاہ ڈالی نہ ڈالی اور پھر دوڑ گیا۔ وشاکھا تو بغل کے کمرے میں گئی تھی، اسے چلا کر لے آیا۔

وشاکھا پرسکون دل سے آئی۔ وارڈ بوائے سے بولی، ''جاؤ فریج میں جوس رکھا ہے لے آؤ۔ پھر بڑبڑائی سی بولی، ''بغل کے کمرے میں ایک عورت کو بھرتی کیا ہے۔ ان کی طرح ہی پڑی ہے، لیکن وہ تو مفلوج ہے۔ میں بھی کہاں اسے دیکھنے چلی گئی۔'' وارڈ بوائے کے آنے تک سرنج صاف ہوگئی...... سب گلے کے نیچے فوراً اتر گیا جیسے ندی سے سیلاب کا پانی اتر گیا ہو۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آئے۔ میرا چیک اپ کیا پھر وشاکھا سے بولے، ''ہر دو گھنٹے میں جوس دینا، بھولنا مت...... میں دوا بھیجتا ہوں وہ ناک سے......'' ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ابھی سو جائیں گے۔'' میری زبان اینٹھنے سی لگی۔ اچانک چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، ''میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں، ایسی کوئی دوا دے دونا۔''

آج دیسائی دیکھنے آئے ہیں۔ وشاکھا کو کچھ پرانی باتیں یاد آگئیں۔ میری میز کے پاس ہی دیسائی کی میز تھی۔ شادی ہوتے ہی میں نے استعفے دے دیا تھا۔ دیسائی نے کہا تھا، ''وشاکھا بہن آگے کی تو سوچو۔ آج کل کسی کو نوکری ملتی نہیں اور آپ لگی بندھی روزی روٹی کو لات مار رہی ہیں؟ دو چار سال میں سارا ارمان پکھل جائے گا۔ پھر کل کس نے دیکھا ہے؟'' میں چڑھ گئی تھی، اس کی بات سن کر، لیکن خاموش رہی۔ اس وقت ایک ہی دُھن سوار تھی مجھ پر، اپنے پتی کو جیون سے بھر دینے کی ایک ایک پل کو یادگار بنانے کی۔ نوکری کرتے یہ ممکن نہیں تھا۔ ان کی تنخواہ بھی تو اچھی ہے، اس لیے کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ دیسائی کی بات سچ ہے، کل کی کسے خبر ہے؟' مان لو، اگر انھیں کہیں کچھ ہو گیا تو...... نہیں، نہیں، میں نہیں برداشت کر سکوں گی۔ پھر سوچا کہ یہ تو بات کرنے کی بھی حالت میں نہیں ہیں، تب؟ ان کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس طرح کب تک ہسپتال میں بیٹھے بیٹھے سانسیں گنتی رہوں گی۔ اس وقت ان کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی ہے اور میں اپنی قسمت کے بارے میں سوچ رہی ہوں؟ کیا کروں؟

ابھی ابھی جس عورت کو داخل کیا ہے۔ اوہ...... مشکل سے وہ میری عمر کی ہوگی۔ بے چاری مفلوج ہوگئی۔ دو تین دن بخار تھا، ڈاکٹر نے دوا دی، کہتے ہیں کہ دوا کی گڑبڑی کی وجہ سے اسے فالج مار گیا۔ یہ ڈاکٹر بھی...... میں نے اخبار میں ایک واقعہ پڑھا تھا۔ ایک مریض کو درد کم کرنے کے لیے دی جانے والی دوا سے ہی اس کا مرض اور بڑھ گیا تھا۔ جب مریض کی موت ہوگئی، تب ان وجوہات کا پتہ چلا۔ کہیں ان کا کیس بھی تو......؟ ریڑھ کی ہڈی کے پاس سپاری جیسی گانٹھ نکلی تھی۔ چھوٹا سا آپریشن...... ڈاکٹر کہتے، فکر کرنے جیسا کچھ نہیں ہے، یہ تو عام بات ہے......' لیکن میں پوچھتی ہوں کہ انھیں ہوش کیوں نہیں آتا؟ اس سے تو گانٹھ بڑھ جائے گی تو اور پریشانی ہوگی، اس سے پہلے......'' انھیں شاید کینسر کا بھی شبہ تھا...... تو پھر ڈاکٹروں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

یہ عورت تو پورے ہوش میں ہے۔ کیا نہیں بیتتی ہوگی اس پر۔ دیکھا جائے تو میں بھی تو فالج زدہ ہوں اس کی طرح۔ چھ مہینے ہو گئے۔ اس ہسپتال کے باہر کی دنیا کو دیکھے۔ ایک کے بعد ایک آنے والوں کا شور، طرح طرح کے مشورے، بے چارہ...... وغیرہ کا مخاطب سنتی رہتی ہوں دن بھر۔ ایسے میں کہاں ڈھونڈوں اپنی زندگی؟ دیسائی نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس عورت نے کتنے خواب دیکھے ہوں گے، سارے بکھر گئے۔ کیا ہوتا ہوگا اس کی خواہشوں کا؟ اسے تو جسم کا ساتھ ہی نہیں، جبکہ یہاں تو جسم کی دوڑ ہی خواہش کے خلاف ہے۔ کل ان بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے رواں رواں درد سے بھر اٹھا تھا۔ کیسے شانت کردوں یہ درد؟ انھیں دوائیں اور جوس دے کر! کبھی دل میں آتا ہے کہہ دوں کہ ایک ساتھ پندرہ بیس ڈوز دے دو مجھے یا پھر انھیں، لیکن فوراً خود کو سنبھالتی ہوں۔ ایسی حالت میں اپنے جوش...... وہ تو خود ہل بھی نہیں سکتے۔

دن بھر دیکھتی رہتی ہوں۔ اس عورت کا شوہر آدھا پون گھنٹہ اس کے پلنگ کے پاس بیٹھتا ہے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باہر برآمدے کی بینچ پر۔ بیٹھے بیٹھے یا تو وہ اخبار پڑھتا رہتا ہے یا کچھ گنگناتا رہتا ہے۔ وہ بھی میری طرح بے چین ہوگا؟ دکھ تو ہوتا ہی ہے مریض کی حالت پر، لیکن اس کے ساتھ رہنے والے کا درد تو...... اس کی کوئی دوا نہیں تلاش کی گئی ہوگی؟ اتنے دنوں سے یہاں ہوں۔ گھوم پھر کر برآمدے میں جاتی ہوں، کبھی کسی نرس کے ساتھ بات چیت میں لگ جاتی ہوں۔ کسی بھی طرح شاید جی کچھ ہلکا ہو جائے۔

کل رات تو رمابین نرس نے مجھے حیران ہی کر دیا۔ فون کی گھنٹی کب سے بج رہی تھی۔ کوئی اٹھاتا ہی نہ تھا۔ میں دوڑ کر باہر گئی۔ رمابین کہاں چلی گئی ہوگی؟ میں بہت دیر تک اس کی میز کے سامنے کی بینچ پر بیٹھی رہی۔ محسوس ہوا کہیں سے سرگوشی کی آواز آرہی ہے۔ یہ یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک نگاہ پڑی اور دھیان آیا کہ جس کمرے کے دروازے پر شام تک تالا لگا تھا، وہ اس وقت اندر سے بند تھا۔ میں بیٹھی رہی۔ دس منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کوئی مرد نکلا اور سرسراتا سا چلا گیا۔ میز پر رکھے کاغذات کب سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں نے ان پر پیپر ویٹ رکھ دیا تھا۔ کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک پل کے لیے میں دہشت سے بھر گئی۔ تبھی رمابین دروازے سے باہر نکلی۔ وہ آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے دیکھ کر بولی، ''میرے مسٹر تھے۔ کیا کریں؟ میری ہمیشہ نائٹ ڈیوٹی......'' میں اٹھ کر اندر گئی۔ سوچنے لگی، ہسپتال چھوڑ کر گھر چلی جاؤں۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انھیں کھینچاؤ آنا بند ہو جائے تو ہسپتال سے چھٹی دینے میں کوئی دقت نہیں۔ پھر دوا اور جوس تو گھر پر بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر آج میں

نوکری کرتی ہوتی تو؟ اتنی چھٹیاں کیسے ملتی؟ یہاں آنے کے بعد میڈیکل اسٹور کے سوا وہ کہیں گئی ہی نہیں۔ دن میں تین بار کپڑے بدلنے والی میں چھ مہینے سے تین جوڑے کپڑوں میں دن گزار رہی ہوں۔ تیار ہونا، سجنا، سنورنا تو بھول ہی گئی۔ سارا دن اس ہسپتال میں دواؤں اور فنائل کی بو اور وہی فضا۔ کیا پتہ کب گھر جانا ہو سکے گا؟ گھر اکیلی جاؤں گی یا پھر؟ آج کل ایک بھی خیال اچھا نہیں آتا۔

گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کل رات سے تو رہا ہین کا ہی خیال آرہا ہے۔ چلو کچھ دیر برآمدے میں ہی ٹہل لوں۔ اس عورت کا شوہر بیٹھے بیٹھے جمہائی لے رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے بینچ پر میرے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ پھر آہستے سے بولا، ''کیسی طبیعت ہے اب ان کی؟'' کیا جواب دوں؟'' ویسی کی ویسی ہی۔'' میں نے کہا۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ سوچا اس کی بیوی کی طبیعت پوچھوں، لیکن نہ پوچھ سکی۔ میرے دل کی بات شاید وہ سمجھ گیا ہو، اس طرح اس نے بتانا شروع کیا، ''میری بیوی پوری طرح ہوش میں ہے، یہی تو دکھ ہے نا! آدھا جسم جامد ہو گیا ہے۔ ایک ماہ ہو گیا۔ اسے بھی نیند کی گولیاں دی جارہی ہیں۔ ہم نے تو سب ایشور کے بھروسے چھوڑ دیا ہے.....''

''یہاں برآمدے میں سرسراتی ہوا آتی ہے، ہے نا؟ اندر تو.....'' میں اچانک بول پڑی۔

''آپ تو چھ مہینے سے یہیں ہیں۔ اوب گئی ہوں گی نا!'' میں کیا کہوں؟ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر پوچھا۔'' آپ دو دن میں ہی اوب گئے کیا؟''

''اوہا تو نہیں۔ ایک ماہ سے ایسا ہی چل رہا ہے۔ بھاگ دوڑ، ٹینشن۔ یہاں آنے سے پہلے سول ہسپتال میں تھے۔ وہاں کوئی فائدہ نہیں ہوا، تو یہاں لے کر آئے۔ یہاں کے ڈاکٹر ہشیار ہیں اور اسٹاف بھی اچھے ہیں۔''

میری نظروں کے سامنے رمابین کا چہرہ گھومنے لگا۔ پھر فوراً اس عورت کا خیال آیا۔

''ان کی عمر ہی کیا ہے؟ ابھی سے یہ بیماری.....'' مجھے لگا اس طرح تجسس ظاہر کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

''آپ کی تو زندگی جیسا کچھ بچا ہی نہ ہوگا نا؟ آخر چھ مہینے کیا ہوتے ہیں.....'' اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں نے آنچل ٹھیک کیا۔ کمرے سے اس کی بیوی کی کسک بھری آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر اندر گیا۔ میں بینچ سے اٹھ کر برآمدے میں چہل قدمی کرنے لگی۔ ادھر سے ادھر ایک چکر..... دوسرا چکر..... میں اس کے آنے کی راہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا۔ مجھے سکون ملا۔'' پانی پلا آیا ہوں۔'' کہہ کر وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں قطاط ہو گئی۔'' انھیں جوس دینے کا وقت ہو گیا ہے۔'' بول کر میں اندر گئی۔ وہ بھی دبے پاؤں میرے پیچھے آیا۔ میرا قیاس بھی یہی تھا۔ ملے نہ کر سکی قیاس یا توقع؟ سرنج تیار کر جوس لانے کے لیے پاؤں اٹھائے ہی تھے کہ وہ بولا،'' لے آتا ہوں۔'' اس نے قدم اٹھائے۔ میں نے کہا،'' فریج کے نچلے حصے میں داہنی طرف۔''

مجھے اس سے مدد لینے میں کوئی جھجک نہیں ہوئی۔ وہ تو ٹھیک، لیکن میری آواز اتنی فطری کیسے ہو گئی؟

نلی میں جوس ڈالتے وقت سرنج پر کافی دباؤ ڈالنا پڑتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے سرنج لے لی۔ ہاتھ کا ہلکا سا لمس بھی ہوا۔ سرنج واپس لیتے وقت ایک بار پھر سہرن ہوئی۔ پتہ نہیں..... یہ سب کیوں اچھا لگ رہا ہے مجھے؟ پلنگ کی چادر ٹھیک کر میں باہر نکلنے ہی والی تھی کہ وہ پھر میرے سامنے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا۔ لگ رہا تھا جیسے میں ابھی اس کا ہاتھ پکڑ لوں گی۔ میں جان بوجھ کر اس سے دو قدم پیچھے ہی رہی۔ برآمدے میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ پنکھے کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے جسم کو تھوڑا کھینچا۔ پھر گہری سانس چھوڑتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں پریشان، دوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ آتے ہی بستر پر گر پڑی۔ جسم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر دونوں پاؤں سمیٹ لیے۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ کھڑکی کا دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھڑ کھڑا رہا تھا۔ وہ ابھی بھی ہاتھ باندھے بینچ پر بیٹھا ہوگا؟

اچانک، یہ کیا ہوا! یہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میری بغل میں آکر لیٹ گئے۔ پانی میں بھیگتے چنار کی طرح ان کا ہاتھ میرے جسم پر رینگ رہا ہے۔ میں آنکھیں بند کیے ہی ان کے اور قریب ہو جاتی ہوں ان کی بانہوں نے مجھے پورا کا پورا دبوچ لیا ہے۔ میں نے خود کو کھڑکی کی طرح پورا کھلا چھوڑ دیا ہے۔ ہواؤں کا آنا جانا جاری ہے۔ ان کی سانسیں سکاریوں میں کیسے بدل گئیں؟ اب تو سسکاری بھی نہیں..... شدید درد میری چیخ..... موت کی دردناک چیخ.....! یہ چیخ کس کی ہے؟ کہیں ان کی تو نہیں؟ بس! اتنی ہی دیر؟ میں یکبارگی جاگ جاتی ہوں۔ ان کا سرد سا جسم کسی مخصوص لمحے کے انتظار میں پڑا ہے۔ سانس تو برابر چل رہی ہے۔ تو پھر؟ مجھے وہم ہوا کیا؟ کسی کے بھاگنے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کیا ہوگا؟

میں ساڑی ٹھیک کرتی برآمدے کی طرف بھاگی۔ دیکھا..... بینچ خالی تھی۔ فوراً ہی اس عورت کے کمرے کی طرف لپکی۔ وہ زور زور سے ہچکیاں لے رہی ہے۔ اس کی ناک اور منہ سے پھنکار بھری آواز نکل رہی ہے۔ سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ اس کا پورا جسم دو تین بار ہوا میں اچھلا۔ منہ سے جھاگ..... اور آہستہ آہستہ..... سب کچھ شانت ہو گیا۔ شوہر نے اس کا پکڑا ہوا ہاتھ دھیرے سے چھوڑ دیا..... میں چادر اوڑھاتی ہوں۔ گلے تک آکر ہاتھ رک گئے..... پھر منہ ڈھانپ دیا..... دوڑتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آئی..... ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھوٹ پھوٹ کر.....!!

گجراتی سے ترجمہ: خورشید عالم

پتہ:
F-58, Sector-40, NOIDA-201301 (U.P.)

مولانا عبدالماجد دریابادی

(گاہے گاہے بازخواں)

جھوٹ میں سچ

قصۂ گل بکاؤلی بھی کوئی کتاب میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالے میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر حقارت کا تبسم آجائے۔ لیکن کیا ہرج ہے اگر کبھی کبھار خلاف وضع صحبتوں کا تحمل کرلیا جائے اور پھر دنیا میں یوں بھی تو ہوا ہے کہ پھٹی پرانی گدڑیوں سے لعل وجواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام کے ہیں، ان کے چارلڑکے پہلے سے موجود ہیں، پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہوجاتا ہے۔ طبیبوں نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں اور سفر کرتے کرتے ایک مشہور بیسوا کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلے کی فیس ایک لاکھ زرنقد ہے۔ دولت کے نشے میں اندھے شہزادے اس کے مکان پر پہنچ اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پندنامہ نہیں، عشق وعاشقی کا افسانہ ہے۔ چاہیے تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا اور اس "پری جمال" کے حسن و جمال کی مصوری اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق واشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی لیکن اس کے برعکس دیکھیے تو سہی کہ اس موقع پر نظر عبارت ذیل سے دوچار ہوتی ہے:

"سنتے ہی اس مکارۂ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمدللہ مدت مدید کے بعد ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا ہے۔ اغلب ہے کہ دام میں پھنسے اور پھڑک پھڑک کر مرے۔ نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے سو خدا نے ویسے ہی شخص بھیج دیے۔"

ان الفاظ کو خصوصاً جو عبارتیں زیر خط کردی گئی ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد فرمایئے کہ شوق واشتیاق کی آگ کچھ بھڑکی یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہوکر خاکستر بن گئی؟ کتاب ترقیوں کے دور سے بہت قبل کی تصنیف ہے۔ مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کو تریاق کہہ کر پیش کرنے کے "آرٹ" سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے اس کے فریب میں نہ آجانا۔

بیسوا ایک مخصوص چالاکی کے ساتھ جوئے کا کھیل کھیل کر اپنے ہاں آنے والے امیرزادوں کو ہرادیتی تھی اور پھر ان کی جمع جتھا لے لو انھیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ یہی ماجرا ان چاروں شہزادوں کو بھی پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے اپنی چالبازیوں کے کرتب سے بیسوا کو مات کردیا اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا۔ مشرق کی اس بازاری کتاب کا مصنف ان واقعات سے نتیجہ یہ نکالتا ہے:

"اے عزیز تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا۔ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل عرش منزل تیرا جو رونق بخش تاج شاہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرد کا تھا، جب اس کی آنکھ اس خلقت ناپاک پر پڑی اس کی بصارت کو زنگ لگا اور دیدۂ روشن تاریک ہوگیا۔ اب اٹھ اور سرمۂ بینائی ڈھونڈھ یعنی گل مراد کی تلاش کر لیکن راہ میں دنیائے عیارہ کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے مشغول نہ ہونا مبادا وہ فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کرکے بھگا دے اور بعد اس کے مکر کی ملمی اور فریب کے چوہے کی مدد سے پانسہ اپنی مرضی کے مطابق پھینکے اور اچانک تیرے توکل کا سرمایہ آخر ہوجائے تب تجھ کو دائم الحبس کرے۔ اگر تو صبر کی اعانت سے اس مکارہ کی بازی طلسم کو درہم کردے تو یہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کا ہم نشیں ہے تیری فرماں بردار لونڈی ہوکر چاہے کہ مجھ کو اپنے حسن وجمال سے لبھائے۔ اگر تو اس کے منھ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گل مراد تک تیری دسترس ہو۔"

ضمناً ایک حکایت ایک سادہ لوح برہمن کی آگئی ہے کہ جس نے زنجیروں میں بندھے ایک شیر کو کھول دیا تھا اور شیر نے خود اس پر حملہ کردیا تھا۔ تاج الملوک یہ حکایت اس بیسوا کو سناتا ہے اور معاً بعد ایک ناصح مشفق بن جاتا ہے۔

"اے عزیز سچ ہے جو کوئی بے صبری اور فریاد اپنے نفس کی، جو مثل شیر جسم کے پنجرے میں بند ہے، سن کر اور اس کے حال پر رحم کرکے رسّی اس کے ہاتھ پاؤں سے بے محابا کھول دے تو بہرصورت اپنے آپ کو اس کا لقمہ بنادے مگر خضر راہنما کی دست گیری سے بچے تو بچے۔ اے بیسوا یہ ذکر میں نے تجھ سے اس واسطے کیا کہ تو جان لے کہ طاقت جسمانی طاقت روحانی پر زیادتی نہیں

● یہ مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے 1932 میں اپنے ہفتہ وار اخبار "سچ" میں لکھا تھا جو اپنی خوبی انشا اور معنویت کے لحاظ سے آج بھی قابل مطالعہ ہے۔

● مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ تحریر ہمیں جناب عبدالعلیم قدوائی نے ارسال کی ہے، ہم ان کے ممنون ہیں۔ ادارہ

رکھتی۔ تجھے لازم ہے کہ ان شہزادوں کو چھوڑ دے حق تعالیٰ تجھ کو دوزخ سے نجات دے گا۔ یہ آپ کوئی مبتذل وعامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں یا کسی عارف کے حلقۂ معرفت میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ یہ مشرق کی ایک گری ہوئی تصنیف ہے اس کے مقابلے میں آپ مغرب کے کسی بلند پایہ قصے کو تولائیے۔

تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے گل بکاؤلی قلعۂ بکاؤلی کے اندر ہے اور قلعہ کے پہرے پر اٹھارہ ہزار دیو مقرر ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا ہے اور ان کی ایک بوڑھی سردارنی حمالہ کا دل اس حد تک اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ سے اس کا نکاح کردیتی ہے۔ افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب یوں مڑ جاتا ہے:

''اے عزیز روشنی چشم ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کے نور دیدۂ اولیا ہے، ستر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے تہمہان دیو نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر کہ وہ لعین اپنی کج روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام پر پہنچا دے لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے الٹا کیجیے تو سیدھا پڑے۔'' محمودہ کی تلمیح قرآن پاک کے مقاماً محمودا کی جانب ہے

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے اور اس عزیز الوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر سخت پریشان اور ملول ہوتی ہے۔ پری خانے کی کنیزیں اور خواصیں صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش وسعی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر بکاؤلی خود اس چور کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے اور تلاش وجستجو میں ہر طرح کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتی ہے۔ افسانہ نگار اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درسِ معرفت شروع کردیتا ہے:

''سبحان اللہ کیا اٹلی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا اور عاشق اس کا مطلوب لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے کیونکہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو اس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔ آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان میں مشتعل ہے فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے:

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
گرنہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی۔ قلم کہتا ہے کہ اے شخص بس کر۔''

کیا اب بھی آپ کی یہ رائے قائم ہے کہ اس عامیانہ قصے کا ذکر ایک سنجیدہ پرچے میں لانا نازیبا اور بے محل تھا۔ بادشاہ شہزادہ تاج الملک کی صورت سے بے زار ہو چکا تھا اور اسے ملک بدر کر چکا تھا لیکن شہزادے نے اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ مہینوں بلکہ برسوں کی سختیاں اٹھا کر گل بکاؤلی لے کر آیا۔ راہ میں چاروں بڑے بھائیوں نے اس سے چھین کر اس کارنامے کو اپنی جانب منسوب کرلیا۔ بادشاہ اس وقت ان چاروں سے بہت خوش ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایۂ تخت کے قریب پہنچا اور دیووں کی مدد سے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر نہایت ہی پر رونق آباد کیا اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت شروع کی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس ہو کر بہتر سے بہتر اطلاعیں پہنچائیں آخر بادشاہ خود ملنے آیا اور یہ پہچان کر کہ اپنا ہی لخت جگر ہے بے حد مسرور ہوا، گلے سے لگایا، ہر طرح کے اعزاز و اکرام سے سرفراز فرمایا اور وہ چاروں بھائی مقہور ومردود قرار پائے۔ قصے کے اس جھوٹ میں سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:

''اے عزیز تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہوگی، چاہیے کہ شہزادے کے مانند کارشائستہ کرے تو تیری محبت شاہ کے دل میں موثر ہو اور پیغام اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے۔ بلکہ بے باکانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی سے لگائے۔ اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو لیکن آخر کار اسی مقام میں آپ کو پہنچائے کہ وہاں تیرا کوئی شریک نہ ہو سکے۔ پھر ایسا کام نہ کیجو کہ شہزادوں کے مانند داغ لعنت اٹھائے اور کس و ناکس کے روبرو رسوا ہو۔''

رینالڈ اور میری کارہلی، ایڈگر ویلس اور آسکر وائلڈ کو چھوڑیے۔ اسکاٹ اور جارج ایلیٹ اور تھیکرے، برنارڈ شا اور ایچ جی ویلز کے ہاں بھی اس انداز کے معارف اور مواعظ ملیں گے؟

تاج الملوک ایک بار پھر آفات ومصائب کا شکار بنا۔ طلسمی عصا اور ٹوپی کو الگ رکھ کر سو گیا، سو کر اٹھا اور ایک حوض شفاف میں نہانے کو اترا تو مرد سے عورت بن گیا۔ طرح طرح کے مصائب جھیلے، مدت کے بعد پھر ایک حوض میں غوطہ لگایا، اب کی جو سر نکالا تو از سر نو اپنی اصلی ہیئت پر آگیا۔ یہ طلسماتی کارخانہ داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینۂ حقائق ومعارف بن جاتا ہے:

''اے یاران دہر! حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور عصمت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعۂ آخرت ہے، عافیت کی تحصیل کے لیے بھیجا ہے، پس انسان کو چاہیے کہ گل وخار اور آب و سراب کو خوب پہچانے۔ ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے، ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اور اکثر شراب بصورت آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا مقرر اپنا کلاہ وعصا کھووے گا۔ یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا مؤنث ہیں اور طالب مولیٰ مذکر۔ تیرا پیکر معانی جو بعد مرد کامل ہے، بصورت زنانِ ناقص

المقل ہوجائے گا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر پھر دریائے ذکر الٰہی میں غوطہ مارے اس کے بعد جو سر اٹھائے گا وہی عصا ہاتھ میں اور وہی ٹوپی سر پر پائے گا۔"

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ اور باہم عقد کے خواہاں ہیں لیکن کہاں پری کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوئی ہے کہ خاک کے ساتھ اپنی نور نظر کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبو دی جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر مہربان ہو جاتی ہے، اس کی سفارشی بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو یہی چھڑتی ہے اور اس وقت یہ پری رومی وغزالی کی بولی میں حقیقت انسانی پر یوں ایک مقالہ سنا جاتی ہے:

"سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبتِ کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے لیکن تو حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے خیال فاسد ہرگز دل میں نہ لاتی۔ سن اے نادان بشر خلیفۂ نیرداں ہے اور اس کی صفت بے پایاں مخلوقات میں اشرف وافضل ہے۔ اس کے رتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بہنے والا اور ایک قطرہ ہے مگر حقیقت میں دریا۔ جامع کمالات علم کوئی الٰہی کا یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور بادشاہت کا۔ جان لے کہ صوفیا ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالےٰ کے ایک ایک اسم اور صفت کا مظہر خاص جانتے ہیں۔ اس عالم میں انسان خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے اور اس کی تجلیات خاص کا مقام۔"

تاج الملوک اک بار پھر آوارۂ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں گھوم رہا ہے۔ گردش سوار ہے۔ اس ملک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بے گناہ کو گرفتار کراتا ہے۔ افسانہ نگار اس بات سے بھی ایک اور بات پیدا کر لیتا ہے:

"سچ ہے جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی گوناگوں تامّل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے نہ پاوے اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے۔ غرض کہ جو فساد اس عالم کون وفساد میں ہو اس کی طرف سے جان لیکن شر نہ سمجھ، کہ در پردہ وہ خیر ہے کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں۔"

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہو جاتی ہے۔ وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں صرف بکاؤلی سمائی ہوئی تھی وہ کسی کے بھی حسن وجمال زیب وزینت سے متاثر نہ ہوا۔ شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی۔ تاج الملک پر یہ آتش باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیے۔ تاج الملوک کی شادی اس شہزادی سے ہو گئی لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت بکاؤلی ہی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رخ معاً یوں پھیر دیتا ہے:

"اے عزیز جب تک تیرے دل کی آنکھیں اغیار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی ہر چند بے پردہ ہو۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر 92-90 صفحے کی ہے۔ اس مختصر ضخامت کے اندر حکمت ومعرفت، پند وموعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ دو ایک نمونے اور ملاحظہ کرتے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام بکاؤلی کی ایک عزیز روح افزا پر فریفتہ ہو جاتا ہے، باریابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر وحکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشق فانی میں عشق ربانی کا رنگ الگ ملاحظہ ہو:

"اے عزیز اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ مل پاتا اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ جو عاشق معشوق کا رنگ پکڑتا ہے معشوق خود اس کا عاشق ہو جاتا ہے۔ بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے ظاہری غصہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے اور خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں ہونے لگتی ہیں۔ نگاہ عبرت اس میں ایک منظر معرفت دیکھتی ہے۔

"اے عزیز اگر اپنے نور عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے گا تو تجلی یار سے فائدہ نہ پائے گا۔ جو راہ عشق میں آپ سے نہ گزرا وہ منزل مقصود ہی کب پہنچا۔"

روح افزا نے اپنے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر سے پرندہ بنا کر ایک پنجرے میں بند کر کے لٹکا دیا کہ ہر وقت سامنے رہے۔ ماں کو کچھ سن گن ملتی ہے، چور ڈھونڈنے آتی ہے اور گھر کا کونہ کونہ چھان مارتی ہے مگر چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال نہیں جاتا۔ افسانہ نگار یہاں بھی پتے کی بات کہنے سے نہیں چوکتا:

"اے عزیز تو عرش پر کسی کے ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو تیرے خانہ دل میں ہے اس کی تو تجھے خبر نہیں۔ واہ واہ دور کا دھیان اور نزدیک سے آپ انجان۔"

دو سطریں آگے اسی پرند اور قفس کی کہانی ایک پورا مقالۂ حکمت بن جاتی ہے اور وہیں افسانے کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جو کہانی نکہ مشرق تھی اس کا جائزہ آپ لے چکے جو افسانے فخر مغرب ہیں وہ بھی اس کے مقابلے میں ٹھیر سکیں گے، ہمارے ہاں کی جو بچی کتابیں بچوں اتری ہوئی یا بچوں کی لکھی ہوئی ہیں، انھیں چھوڑیے جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں اور جنھوں نے اپنے جھوٹ کو کبھی چھپایا نہیں ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں اور گہری سچائیاں آپ نے دیکھ لیں۔ جس قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچے ہوں، خدا کی شان ہے کہ اسے درس اخلاق وصداقت دینے وہ قوم آئی ہے جس کی تہذیب وتمدن کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

□□□

انجم نعیم

موبائل تھیٹر

دھوپ کی شدت میں کچھ ہی کمی واقع ہوئی ہے لیکن بہار کی راجدھانی پٹنہ کے قلب میں واقع وسیع و عریض اس گاندھی میدان میں شام کی مصروفیات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ تھکے ہارے لوگوں، سیاسی کارکنوں، تفریح کے شائقین، مداریوں اور خوانچہ والوں نے اپنی اپنی پسندیدہ جگہیں سنبھال لی ہیں۔ اسی میں ایک حلقہ 20-15 بچوں پر مشتمل ایک نانک منڈلی کا بھی ہے جو ''لڑکیاں بوجھ نہیں ہیں'' کے عنوان سے اپنی پیشکش میں مصروف ہیں۔ ٹیم کے دو سینئر ارکان ہارمونیم اور ڈھولک سے ان کی آواز میں دلچسپی پیدا کر رہے ہیں اور ان کی پشت پر ایک پرانا سا بینر لٹکا ہوا ہے جو ان کی شناخت متعین کر رہا ہے۔ موبائل تھیٹر۔۔۔ چلڈرن ووہ ویئر اون وائس، پون گھنٹے میں پیشکش مکمل۔ تالیاں بجیں، لوگوں نے تعریفی جملے ادا کیے اور تھوڑی ہی دیر میں بھیڑ منتشر ہو گئی۔ نانک منڈلی بھی جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ رہی ہے۔ ''راجندر نگر میں بھی ایک پروگرام طے ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی دن میں کئی جگہوں پر نکڑ نانک کا یہ پروگرام چلتا ہے۔'' درمیانی قد و قامت کے گم گو اور آنکھوں میں ایک عجب سی چمک رکھنے والے اشوک ادیتیہ، جو نانک کی پیشکش کے دوران مختلف قسم کی معلومات مہیا کر رہے تھے، نے اپنے اگلے میدان عمل کا پتہ بتایا۔ اشوک ادیتیہ سماج کے پچھڑے، ہوس پرستوں کے شکار اور غیر مراعات یافتہ بچوں کو سوسائٹی میں مقام دلانے کے عزم سے 1993 میں قائم کی گئی این جی او، موبائل تھیٹر کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ذاتی طور پر وہ بھی چونکہ شروع سے ہی تھیٹر سے منسلک تھے اس لیے ان کا خیال ہے کہ ''سوسائٹی میں تبدیلی لانے کے لیے نکڑ نانک کا یہ میڈیم سب سے پر اثر ہے۔''

ان نکڑ ناٹکوں نے معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے کا فریضہ ادا کرنے میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے یہ تو ایک الگ مطالعے کا موضوع ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی آبادی کا ایک تہائی حصہ اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں پر مشتمل ہے، ان میں ایک بڑی تعداد غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے گھروں سے تعلق رکھنے والے ان بچوں کی ہے جنھیں خود ان کے ماں باپ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور پھر وہ حالات کا شکار ہو کر معاشرے میں پائے جانے والے تعفن کی ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے بچوں کے گھر والے روزانہ ان سے روپے کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں سے بھی ہو تم کو لانا ہے۔ اکثر ان کو گھروں میں مارا پیٹا جاتا ہے جس کی وجہ سے جو بچے کم پیسے کماتے ہیں یا پھر خرچ کر دیتے ہیں وہ خوف سے راتوں کو گھر نہیں جاتے اور اس طرح رات سڑکوں یا ریلوے پلیٹ فارم پر گزارتے ہیں۔ اشوک ادیتیہ کہتے ہیں کہ ''سڑکوں اور پلیٹ فارم پر رات گزارنے والے یہ بچے اکثر جنسی تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بچیاں بھی۔'' ایسے بچوں کو کسی بھی شہر کے سلم میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ موبائل تھیٹر کے ایک حالیہ سروے کے مطابق صرف پٹنہ کے مضافاتی علاقوں میں رہنے والے بچوں کی تعداد 50000 سے زائد ہے۔ خاندان کی غربت نے انھیں ہوٹلوں، سڑکوں کے کنارے پائی جانے والی چائے کی دکانوں تک پہنچا دیا ہے یا پھر وہ کسی گھر میں بچہ مزدور کی طرح کام کر رہے ہیں۔ خاصی بڑی تعداد ان بچوں کی بھی ہے جو شدید گرمی ہو یا سردی، دن بھر مختلف بازاروں، سڑکوں اور کچرا دانوں کے قریب پرانے سامان، کاغذ اور پلاسٹک جمع کرتے پھرتے ہیں اور بمشکل چالیس پچاس روپے جمع کر کے شام کو اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ چونکہ پیسہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے اکثر نشہ کی لت کے وہ شکار ہو جاتے ہیں۔

موبائل تھیٹر نے سب سے پہلے ان کچرا جمع کرنے والے بچوں کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ موبائل تھیٹر کے کل وقتی کارکن گجندر رنگھ کے مطابق ایسے سو کچرا جمع کرنے والے بچوں کو جمع کیا گیا۔ ان کو اس پر راضی کیا گیا کہ وہ دو پہر تک جمع کیا گیا اپنا کچرا بیچ کر سہ پہر کو موبائل تھیٹر کے سینٹر میں جمع ہو جایا کریں جہاں انھیں نہ صرف گانے بجانے اور نانک کی تربیت دی جائے گی بلکہ انھیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جائے گا۔ تجربہ کامیاب ہوا اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔'' کام آسان نہیں تھا۔ بعض بچوں کے والدین آ کر ہنگامہ کرتے تھے کہ ان کے روزی روٹی کمانے والے بچوں کو برباد کیا جا رہا ہے لیکن آہستہ آہستہ جب ان کی سمجھ میں آیا کہ ان کے بچے بہتر روزی روٹی حاصل کرنے کی تربیت پا رہے ہیں تو ان کا بھی تعاون حاصل ہوا۔ جن بچوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا یا جن بچوں نے غربت کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی ان کے لیے برج کورس کا اہتمام کر کے انھیں پھر اسکول بھیجنے کا بندوبست کیا گیا۔ ان میں سے کچھ ذہین بچوں کو چھانٹ کر پٹنہ سے 40 کلومیٹر

دور بختیار پور کے ایک مشنری ریذیڈنشیل اسکول، بملا ودیالہ میں داخل کرایا گیا۔ اشوک ادیتیہ کہتے ہیں کہ اسکول کے پرنسپل فادر سیبسٹین نے اس سلسلے میں کافی مدد کی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ سینٹر سے آنے والے بچوں سے نصف خرچ لیا جائے گا اور انھیں رہنے کی مفت سہولت فراہم کی جائے گی۔" مشنری اسکول سے کئی بچے تعلیم مکمل کرکے آچکے ہیں اور اس وقت بھی پانچ بچوں کا ایک بیچ وہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اشوک ادیتیہ ایک دلت لڑکی ریتا، جو پہلے ایک گھر میں دائی کا کام کرتی تھی، کی طرف اشارہ کرکے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہتے ہیں "گھر میں جھاڑو پونچھا کرنے والی اس لڑکی کو آج کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ حالات ضرور بدلیں گے۔"

مشنری اسکول سے کامیاب ہونے والے پہلے بیچ کے تین موسہر بچوں، انجنا، پرکاش، ممتا اور پرمود کو لے کر 1955 میں سوئزرلینڈ کے شہر لیودی فاں میں مفلوک الحال اور مظلوم بچوں کے لیے کام کرنے والی تنظیم "ٹیرے ڈی ہومز" کی دعوت اور سفر کے اخراجات کی پیشکش پر ایک عالمی کانفرنس میں اشوک آدیتیہ نے شرکت کی تھی اور وہاں مختلف شہروں میں پروگرام کے دوران اپنے چار رکنی ناٹک منڈلی کے شو پیش کیے تھے اور دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر بچوں کے مسائل پر کام کرنے کی تربیت حاصل کی تھی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والے پرمود، جو اس وقت ایک اسکرین پرنٹنگ پریس میں کام کرتے ہیں اور فاضل اوقات میں موبائل تھیٹر سینٹر میں بچوں کو اسکرین پرنٹنگ کی تربیت دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ "اس عالمی اکسپوزر نے ان میں نہ صرف بچوں کے مسائل کی شدت کا احساس پیدا کیا بلکہ زندگی کو ایک مقصد بھی عطا کیا جسے میں آج اپنی پہچان سمجھتا ہوں۔"

سوئزرلینڈ کا دورہ نہ صرف تجربات کے نقطۂ نگاہ سے مفید تھا بلکہ کام کرنے کی راہ میں پیدا ہونے والی سہولیات کے اعتبار سے بھی فائدہ مند ثابت ہوا۔ اب تک موبائل تھیٹر مقامی افراد کے تعاون سے کام کر رہا تھا۔ اب پہلی بار ٹیرے ڈی ہومز نے کلچرل اور تفریحی پروگراموں کے ذریعے سڑک پر رہنے والے بچوں کی تعلیم کے پروجیکٹ کے لیے تعاون پیش کیا۔ اس کے بعد 2000 میں یونیسف اور 2002 میں امریکی شہر پیریا، ایریزونا کے روٹری کلب کے لٹریسی سینٹر نے بیک ٹو اسکول پروجیکٹ کے لیے 15000 ڈالر کی گرانٹ منظور کی۔ موبائل تھیٹر کی صدر انجنا بھائی 2002 کے اوائل میں امریکہ گئیں تھیں اور وہاں انھوں نے روٹری کلب کے ذمے داروں کے سامنے اپنا پروجیکٹ رکھا تھا۔ روٹری کلب Pioria کی صدر مارتھا ہرم اپنے تین رکنی وفد کے ساتھ اسی سال ہندوستان آئیں اور انھوں نے موبائل تھیٹر کا کام دیکھ کر اس کے پیش کردہ پروجیکٹ کے لیے گرانٹ کی منظوری دے دی۔ اشوک ادیتیہ کے مطابق اس وقت ان کے سینٹر میں جو ووکیشنل ٹریننگ سینٹر اور تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں ان کے لیے امریکی سفارت خانے کے شعبۂ رابطۂ عامہ کے گرانٹ کا تعاون حاصل ہے اور اس تعاون نے سینٹر کے کاموں کو کافی آگے بڑھایا ہے۔

منسٹری فار ویمین اینڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ کے ایک حالیہ مطالعے کے مطابق ہر تین میں سے دو بچے جسمانی زیادتی کا شکار ہوتے ہیں اور اس میں صرف لڑکیاں ہی نہیں بلکہ لڑکے بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ اشوک ادیتیہ کہتے ہیں کہ "سب سے زیادہ جو فکر کی بات ہے وہ یہ ہے کہ جنسی استحصال کے شکار ہونے والے ان بچوں، جن کی ایک بڑی تعداد فٹ پاتھوں اور ریلوے پلیٹ فارم پر رہتی ہے، کے جنسی استحصال نے ایک نئی بھیانک صورت حال سامنے لاکر کھڑی کردی ہے۔ اور وہ ہے ایڈس کی آمد کی ایک نئی کشادہ راہ۔" جو بچے اور بچیاں ریلوے پلیٹ فارم پر ہی رہتے ہیں، ریل کے ڈبوں میں جھاڑو وغیرہ دے کر یا گا بجا کر کمائی کرتے ہیں، ان کے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پیسے پس انداز کریں یا کوئی پسند کی چیز خریدیں کیونکہ ان کے پاس نہ رکھنے کی کوئی جگہ ہوتی ہے اور نہ پس انداز کرنے کی کوئی وجہ۔ لہٰذا بہتر کھانا، عشرت کے لیے نشہ خوری کرنا یا پھر آپس میں جنسی تلذذ حاصل کرنا، ان کے معمول کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ایسے بچے اور بچیوں پر بردہ فروشی کرنے والے لوگوں کی نگاہ ہوتی ہے اور یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے جاتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک مخصوص تعداد ان بچوں اور بچیوں کی ہوتی ہے جو نہ صرف خود ایچ آئی وی/ایڈس سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ وہ مستقل اس کے دائرہ کو بڑھانے کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ اشوک ادیتیہ کہتے ہیں کہ "ایسا لگتا ہے کہ ہمیں صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنی ساری توانائی ایسے بچوں کی دیکھ ریکھ میں لگا دینا چاہیے جو نہ صرف خود تباہ ہو رہے ہیں بلکہ موت کی عفریت میں اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔" موبائل تھیٹر نے گزشتہ سال پٹنہ کے مختلف ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر رہنے والے تقریباً 100 بچوں کو یکجا کیا تھا اور پروگرام کے بعد ان میں سے 15 بچوں سے مستقل رابطہ رکھ کر ان کو سینٹر میں باضابطہ ووکیشنل ٹریننگ دی گئی تھی اور اب ان میں کئی بچے اور بچیاں اسکرین پرنٹنگ، کپڑوں پر پینٹنگ اور فوٹو گرافی کے کام میں مصروف ہیں۔ اسوک آدیتیہ کہتے ہیں کہ "سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان بے جڑ کے پودوں کو اگر ذرا سی محبت اور نگرانی مہیا کرائی جائے تو یہ خود پھل پھولنے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔"

(بہ شکریہ --- اوپین، نئی دہلی، بابت جولائی تا اگست 2007)

□□□

عارف عزیز

''بھوپال پنچ'' — بھوپال کا ایک یادگار اخبار

سرزمین بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والے اخبارات و رسائل کی تعداد سو سے زیادہ ہے لیکن ان میں سے معدودے چند ہی اخبار اور رسائل ایسے ہیں جنھوں نے اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کی۔ ان اخبارات میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شائع ہونے والے ہفت روزہ ''بھوپال پنچ'' کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے بھوپال میں طنز و مزاح کی روایت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

''بھوپال پنچ'' کا پہلا شمارہ یکم جنوری 1960 کو نکلا۔ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے عبدالاحد خاں تخلص کے بھتیجے عبدالواحد خاں کا نام دیا گیا لیکن تخلص بھوپالی اسے خود ایڈٹ کرتے تھے۔ اس کی اشاعت کا دن اتوار تھا اور یہ 30X30 سائز پر تخلص صاحب کے ذاتی ہینڈ پریس پر طبع ہو کر عموماً چار صفحات پر شائع ہوتا تھا جس کی قیمت 13 پیسے مقرر تھی۔ ''بھوپال پنچ'' لکھنؤ کے ''اودھ پنچ'' کی طرز پر طنز و مزاح کے لیے مخصوص تھا، جس میں اس دور کے معروف طنز و مزاح نگار، کبھی فکر تونسوی، کبھی کنھیا لال کپور، کبھی احمد جمال پاشا، کبھی دلاور فگار اور کبھی ماچس لکھنوی تخلیقات شامل ہوتیں۔ کسی شمارے میں دوسرے اخبارات و رسائل کی دلچسپ تحریریں بھی نقل کر لی جاتیں۔ عام طور پر اخبار کا بیشتر حصہ تخلص کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا، کچھ عرصے نادم سیتاپوری کا تعاون بھی اخبار کو حاصل ہوا۔

''بھوپال پنچ'' کا پہلا صفحہ اداریے کے لیے مخصوص تھا جس میں کسی اہم وقتی موضوع یا شہری مسئلے کا شگفتہ پیرایہ میں تخلص خود تجزیہ کرتے اور طنز و مزاح کے پیرایے میں سنجیدہ باتیں کہہ جاتے۔ ان میں طنز کی کاٹ اتنی گہری ہوتی کہ جو اس کا نشانہ بنتا تڑپنے کے سوا اس کو دوسرا راستہ نہ ملتا۔ اداریے میں تخلص کا ہدف عموماً بدعنوانی بنتی اور بعض دوسرے پہلوؤں کا بھی وہ احتساب کرتے، مثال کے طور پر ''نربدا بہتی رہی'' کے زیرِ عنوان تخلص مخصوص خبروں پر ایک دو جملوں میں اپنا ردِ عمل ظاہر کر کے ان کو دو آتشہ بنا دیتے تھے۔ ''بھوپالیات'' کے تحت مقامی مسائل کو اپنے نقطۂ نظر سے اجاگر کرتے، ''میونسپلٹیات'' کے تحت میونسپل محکمے کی کارکردگی کا دلچسپ انداز میں جائزہ لیتے، ''پاندان والی خالہ'' اور ''غفور میاں'' کے تحت بھوپال کی پرانی تہذیب کے چلتے پھرتے کرداروں کو ابھار کر ان کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''بھوپال پنچ'' کے طنز و مزاح کی دنیا قدرے محدود ہے۔ اس کی زیادہ تحریریں سرزمین بھوپال اور یہاں کی اس تہذیب کی نمائندہ ہیں جو تیزی سے معدوم ہو رہی تھی، لیکن اس بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کی رائے یہ ہے کہ ''جو ادب جتنا مقامی ہوتا ہے، اتنا ہی آفاقی ہوتا ہے، جتنا زیادہ اپنے زمانے اور اپنے عہد کی گہرائیوں سے جڑا ہوتا ہے اتنی ہی دیر تک زندہ رہتا ہے۔''

''بھوپال پنچ'' نے بے راہ روی کے بڑھتے سیلاب کو روکنا چاہا، جس کی مستقل نہیں تو وقتی اہمیت ضروری تھی۔ ''بھوپال پنچ'' سے بہت پہلے ''اودھ پنچ'' نے حاجی بغلول اور خوجی کے کریکٹر اردو ادب کو دیے، جن کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اسی طرح امتیاز علی تاج کے چچا چھکن اور پطرس بخاری کے مرزا صاحب بھی سراہے گئے۔ ان کرداروں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تہذیب و روایات کی بھرپور نمائندگی کرتے تھے۔ ''بھوپال پنچ'' نے بھی ''پاندان والی خالہ'' اور ''غفور میاں'' کے جن کرداروں سے اردو ادب کو متعارف کرایا، وہ بھوپال کی زوال آمادہ تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان میں خالہ کا کردار غفور میاں سے زیادہ جاندار ہے۔ وہ باتوں باتوں میں ایسے معاشرتی حقائق بیان کر جاتی ہیں، جن تک رسائی طویل بحث و مباحثے سے بھی نہیں ہوتی۔ ان دونوں کرداروں کی اہمیت ان کے کیریکٹروں سے زیادہ ان کے طرزِ گفتار سے ظاہر ہوتی ہے اور اسی گفتار سے ان کی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں۔ یہ دونوں کیریکٹر سماج کی دوسری شخصیتوں سے متصادم ہوتے ہیں تو ان کے مزید پہلو سامنے آتے ہیں۔

ان کرداروں کی حقیقی عکاسی کے لیے تخلص نے کافی مطالعہ کیا۔ اپنے گھر میں کام کرنے والی عمر رسیدہ خواتین سے گفتگو کر کے ان کی زبان، ذہنی ساخت اور غور و فکر کی پرواز سے واقفیت حاصل کی، اسے ناپا، تولا، خاص طور پر اپنی تہذیب سے ان خواتین کے شغف اور نئے تمدن کی ''برکات'' سے ان کی بیزاری کی تہہ میں جو عوامل کارفرما تھے ان کا تجزیہ کیا۔ تخلص کی یہ اسٹڈی جب مکمل ہو گئی، اس کے بعد ہی انھوں نے پاندان والی ''خالہ'' اور ''غفور میاں'' کے کرداروں میں رنگ بھرنا شروع کیا اور صفحۂ قرطاس پر اس مہارت سے انھیں چلتے پھرتے اور بولتے دکھایا کہ نوابی عہد کا بھوپال جو بظاہر ایک قصبے سے بڑا

نہیں تھا لیکن بہاطن بڑی تہذیبی شخصیات، لسانی انفرادیت اور لب و لہجے کے تنوع کا حامل تھا، نظروں کے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔

تخلص کی یہ خوبی ہی تصور کی جائے گی کہ وہ اپنے دونوں کرداروں پر خود حاوی نہیں ہوتے بلکہ انھیں اپنی راہ آپ بنانے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور اس میں جس برجستگی اور بے تکلفی کو وہ برت جاتے ہیں، بالخصوص مقامی لفظیات اور محاوروں کا استعمال کرتے ہیں، اس سے طنز و مزاح کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ مقامی پن حاوی ہونے کے باوجود قاری خواہ شمالی ہند کا ہو یا جنوبی ہند کا، ان سے متاثر ہوتا ہے اور بعض ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی لطف اٹھاتا ہے جو نکسالی زبان کے بجائے مقامی بولی ٹھولی کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر حامد حسین نے تخلص کے ان کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح کہا ہے کہ:

''ان کے یہ کردار اپنی پرلطف بوالعجبیوں کے ساتھ نہ صرف ایک عہد کی زوال پذیر تہذیبی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ ان کے ذریعے تخلص صاحب نے ایک پورے سماج کے لہجے، حرکات و سکنات اور عمل و ردِعمل کو اپنی کاغذی تصاویر میں سمیٹ کر دیا ہے۔ ان تحریرات میں ان کا طنز، ان کے کردار کے قالب سے ابھرتا ہے، جن کی اپنی دنیا ہے اور یہ دنیا اپنی طرز کی بنیاد پر جاذبِ نگاہ ہے۔ طنز اپنے تاثر کے لیے موضوع اور پیکر کے درمیان ایک تخیلی فاصلے کا متقاضی ہوتا ہے اور تخلص صاحب کے یہ کردار اپنے مخصوص تہذیبی رول میں عام تہذیبی تجربے سے جداگانہ اور انوکھے معلوم ہونے کی بنا پر فاصلہ پیدا کرتے ہیں۔''

(مضمون ''تخلص بھوپالی کی طنزیہ صحافت'' روزنامہ ''آفتابِ جدید'' 3 مارچ 1985)

''بھوپال پنچ'' کے صفحات تخلص نے متنوع اصطلاحات کی تخلیق کر کے ان کو ''پنچ ڈکشنری'' کے عنوان سے متعارف کرایا ہے۔ خود ان کی تحریروں میں بھی ایسے فقرے ملتے ہیں جن کو ایک خاص مفہوم میں برتا گیا ہے۔ بطور مثال شاعری کے لیے ''غالبی''، مسلم اوقاف کے لیے ''مسلم کوہ قاف'' جمہوریت کے لیے ''اشفاصی نظام'' مسلم قوم کے لیے ''قوم یتیم'' رومان پرستی کے لیے ''بجنوں ازم'' ریاح کے لیے ''پلے بیک ڈکاریں'' اور کانگریس کے لیے ''کنگ ریس'' وغیرہ۔

''بھوپال پنچ'' نے خاکہ نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ اس میں شائع شدہ کچھ خاکے جو ہر قریشی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں، باقی سبھی ''پوسٹ مارٹم'' کے عنوان سے زندہ اور مرحوم شخصیتوں پر تخلص نے خود قلم بند کیے ہیں اور اس فنکاری سے شخصیتوں کا خاکہ اڑایا ہے کہ خواجہ عبدالغفور کے الفاظ میں ''جیتے جی حیاتِ جاوداں بخش دی اور مردوں کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔'' یہ خاکے تخلص کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ ان میں مذہبی قائدین سے لے کر سیاسی و سماجی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں، ہم عصروں غرض یہ کہ مختلف شعبوں کی شخصیات شامل ہیں، جن کا پوسٹ مارٹم کر کے تخلص نے اپنی ذکاوت و ظانت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان خاکوں سے متاثر ہو کر رشید حسن خاں کہہ اٹھے تھے کہ ''فقروں کی تہہ داری، شگفتگی اور معنویت نے قدم قدم پر دامنِ نگاہ کو تھام لیا، آپ نے اس فقرے کو صداقت عطا کر دی کہ مزاح نگار واقعی تلوار کی دھار پر چلتا ہے۔'' (''شیطان جاگ اٹھا'' صفحہ نمبر 14)

تخلص کے ''بھوپال پنچ'' میں شائع شدہ مضامین کا ایک مجموعہ ''شیطان جاگ اٹھا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ 29 مضامین ہیں جو مختلف کیفیات اور متنوع موضوعات پر رقم کیے گئے ہیں۔ قاری کے لیے بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ بصیرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان میں تخلص نے معاشرے کی کسی نہ کسی خامی یا کمی کو سامنے رکھ کر اس پر نشتر زنی کی ہے۔ ان کا مقصد کسی نقطۂ نظر یا ازم کا پروپیگنڈہ نہیں، اصلاحِ حال ہے جس کے لیے احمد جمال پاشا کے الفاظ میں ''تخلص شمشیر زنی، گولہ باری اور بمباری تک اتر آتے ہیں۔''

اخبار کے جن عنوانات کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ بھی کچھ اور عنوانات ملتے ہیں، جن میں ''پنچ بھون'' کے عنوان سے پنچ بھون کی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر ادبی خبریں، شگفتہ پیرایے میں دی جاتیں۔ کبھی اسی کالم میں قارئین کے خطوط کے تفصیلی جوابات دیے جاتے یا دیگر مسائل پر اظہار خیال ہوتا۔ ''اقوالِ زریں'' کے تحت ایسے اقوال شائع کیے جاتے جن میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہو، جبکہ ''ایڈیٹر کی ڈاک'' میں تخلص کے نام مراسلے شائع ہوتے۔ بعض اوقات ان مراسلوں پر ایڈیٹر کا نوٹ بھی درج ہوتا۔

بحیثیت مجموعی ''بھوپال پنچ'' میں تخلص مزاح برائے مزاح کم اور مزاح برائے مقصد پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس اخبار کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی۔ دو سال اور نو ماہ تک پوری آب و تاب نیز پابندی کے ساتھ شائع ہو کر اور کبھی قہقہے اور کبھی آنسو بکھیر کر یہ اخبار اس وقت بند ہو گیا جب ہندوستان پر ہمسایہ ملک چین حملہ آور ہوا اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ تخلص کے الفاظ میں عزت و آبرو بچانے کا یہی راستہ تھا کہ ''بھوپال پنچ'' کو بند کر دیا جائے، لہٰذا 14 نومبر 1962 کو اپنی علالت کا عذر کر کے تخلص نے یہ اخبار بند کر دیا، پھر بھی پونے تین سال کی مدت میں اس اخبار نے اردو صحافت میں اپنے لیے جو مقام متعین کر لیا تھا وہ آج بھی برقرار ہے اور ''بھوپال پنچ'' کو ایک یادگار اخبار تصور کیا جاتا ہے۔

□□□

پتہ:
20 Ghati Bharbhooja Road,
Talayya, Bhopal-462001

محمد خلیل

مستقبل میں اَلجی پودے بطور غذا

دنیا کی آبادی میں آج بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے جس سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں غذائی بحران ایک اہم مسئلہ ہے، جس نے عالمی توجہ حاصل کی ہے۔ سائنسداں بھی اس مسئلے سے باخبر ہیں۔ سمندری نباتات میں اَلجی (اَلگی) نامی پودوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تمام سمندروں میں پائے جاتے ہیں۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس پودے کے ذریعے غذائی بحران کو حل کیا جا سکتا ہے۔

اَلجی پودا 0.5 مائکرون سے لے کر سیکڑوں فٹ تک لمبا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک خلیے (سیل) والا پودا ہے، یعنی اس کا جسم صرف ایک خلیے پر مشتمل ہے جو لاکھوں ذیلی خوردبینی خلیوں سے بنا ہوتا ہے جنھیں آپ بغیر خوردبین کے نہیں دیکھ سکتے۔ ان پودوں میں جڑ، تنا، پتیاں، پھول اور پھل وغیرہ نہیں ہوتے لیکن پھر بھی آپ اَلجی پودوں کو غذا کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں لحمیہ (پروٹین)، چربی اور حیاتین پائے جاتے ہیں۔ ان پودوں کو دنیا کے کسی بھی حصے میں پورے سال اُگایا جا سکتا ہے۔ حسب ضرورت ان کی کاشت کی جا سکتی ہے۔ یہ پودے اپنے اوپری حصے (جلد) کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں اور ماحول سے نائیٹروجن فاسفورس اور دوسرے عنصر ساتھ ہی غیر حیاتیاتی اجزا حاصل کرتے ہیں۔

اَلجی پودوں کو رنگ کے لحاظ سے چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: سبز اَلجی، نیلا اَلجی، سرخ اَلجی اور بھورا اَلجی۔ اَلجی کی کچھ قسمیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں اور پانی پر تیرتی رہتی ہیں۔ انھیں فائی ٹوپلینکٹن کہتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف بڑے اَلجی بھی پائے جاتے ہیں۔ انھیں ہم بحری گھاس کہہ سکتے ہیں جو ساحلی علاقوں میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اَلجی کو جھیلوں، تالابوں یہاں تک کہ ریگستانوں میں بھی اگایا جا سکتا ہے۔ اسے اگانے کے لیے روشنی، پانی اور کچھ کیمیائی اجزا کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ پودے تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ان پودوں کے بارے میں معلومات دوسری جنگِ عظیم سے پہلے سائنسدانوں کو تجربات کے دوران حاصل ہوئی۔ اس وقت سے سائنسداں اَلجی پر مسلسل تجربات میں مصروف ہیں اور اس کے مفید نتائج سامنے آئے ہیں۔ اَلجی کے چھوٹے سے خلیے (سیل) میں اچھے قسم کے غذائی اجزا موجود ہوتے ہیں۔ اس پودے میں ہرے رنگ کا ایک مادّہ (کلوروفل) بھی پایا جاتا ہے، جس کی مدد سے پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سے سورج کی روشنی میں اَلجی پودے اپنی غذا تیار کرتے ہیں۔ اَلجی میں کاربوہائیڈریٹس، نشاستہ، غیر نامیاتی اجزا اور حیاتین وغیرہ پائے جاتے ہیں جو ہماری صحت مند زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اَلجی پودوں میں حیاتین اے، ای، سی اور ڈی خاص طور پر موجود ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اَلجی کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جن میں لحمیہ کی فیصد ایک انڈے میں پائی جانے والی مقدار سے بھی زیادہ موجود ہوتی ہے۔ اس طرح اَلجی پودوں سے مختلف قسموں کی لذیذ غذائی اشیا تیار کی جا سکتی ہیں۔ اَلجی پودے جانوروں کی بھی غذا ہیں۔ سمندری کیکڑوں، سیپیوں اور مچھلیوں کی کچھ ایسی قسمیں ہیں جو اسے غذا کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ کلوریلا نامی پودا اَلجی پودوں میں ہی شمار ہوتا ہے۔ اس نے اپنی خصوصیت کی وجہ سے سبھی کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ آپ اس سے اپنی پوری غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ کلوریلا میں حیاتین کی ساری قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی لحمیہ کی ایک قسم جسے ہم لائیسین کے نام سے جانتے ہیں اور جو انڈے کی سفیدی میں پائی جاتی ہے، یہی لائیسین کلوریلا میں بھی موجود ہے۔

شاید یہ خبر آپ کے لیے نئی ہو کہ آج دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں الجی کا غذائی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح اَلجی غذائی کمی کو دور کرنے میں معاون ہے۔ کلوریلا اور اَلجی کی کئی دوسری قسموں کو تجربہ گاہوں میں کاشت کیا جا رہا ہے تاکہ مستقبل میں ان سے اور فائدہ اٹھایا جا سکے۔ کلوریلا کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جانب غذائی کمی کو پورا کرتا ہے تو دوسری جانب بھوک میں زیادتی کو روکتا ہے۔ کلوریلا کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جنھیں بہت تیزی سے تیار کیا جا سکتا ہے اور اس طرح غذائی اشیا کی مقدار میں کافی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ کلوریلا آکسیجن کی کثیر مقدار خارج کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پودے کا استعمال امریکی بحری شعبے میں آکسیجن کی فراہمی کے لیے ہوتا ہے اور ان کارخانوں میں جہاں اکثر و بیشتر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے، اس پودے کے ذریعے اس مقدار میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ اس لیے آج کلوریلا کا استعمال ماحولیاتی آلودگی کو ختم کرنے کے لیے بھی کیا جا رہا ہے۔

گذشتہ برسوں میں جاپان میں سائنسدانوں نے اَلجی سے روٹی، سوپ اور آئسکریم تیار کی ہے۔ ماہرین تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کلوریلا کے سفوف (پاؤڈر) کو ملا کر روٹیاں بنانے سے اس کے لحمیہ اور چربی میں بیس

فیصد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جاپانی ماہرین نے کلوریلا سے بہت سی قسموں کے سلوف تیار کیے ہیں جن کے ایک چمچے میں ہی لاکھوں قسموں کی اَلجی کا جو موجود ہے۔ یہ صحت کے لیے بے حد مفید اور فائدہ مند ثابت ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانی عوام الجی سے تیار شدہ غذائی اشیا بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک جائزے سے یہ پتہ چلا ہے کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں تقریباً پچیس فیصد غذائی اجزا، اَلجی کے ہیں۔ انگلستان میں بھی اَلوا نامی اَلجی غذائی اشیا میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح برازیل میں تاشاک نامی پودے کو اُبال کر غذائی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اِسپائیروگائیرا نامی اَلجی کو گراس غذائی اشیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صوبۂ راجستھان کے کچھ علاقوں میں لوگ اَلوا نامی اَلجی کو غذائی طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اَلجی کی کاشت کرنا نہایت آسان ہے اور کم جگہ میں کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین اس کی کاشت کو بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے غذائی مسائل کو حل کیا جاسکے۔ اَلجی کی کاشت کچھ ہفتوں میں پوری طرح سے تیار ہوجاتی ہے اور یہ پورے سال کی جاسکتی ہے۔ زمین میں پیدا ہونے والی اَلجی کے مقابلے میں سمندر میں پائی جانے والی اَلجی کی تعداد آٹھ گنا زیادہ ہے۔ سمندری اَلجی حیاتین اور لحمیہ سے بھرپور ہے۔ اس میں حیاتین کی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہے جو ہماری صحت کے لیے ایک اہم جُز ہے۔ اَلجی کے ذریعے کھیتوں کو بھی زرخیز بنا سکتے ہیں اور فصل میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

رُوڈومیلیا ایڈوگونیم، اِسپائیروگائیرا اور کیٹوفورا نامی اَلجی کے پودوں سے غذائی چیزیں آسانی کے ساتھ تیار کرسکتے ہیں۔ اَگاراَگار نامی اَلجی کا استعمال آئس کریم اور جیلی بنانے میں کیا جاتا ہے۔ یہ ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان کے کچھ دیہی علاقوں میں اَلجی کا استعمال غذا کے طور پر ایک عرصے سے کیا جارہا ہے۔ صوبۂ منی پور میں عوام اَلجی کو تل کر کھانا بے حد پسند کرتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے مستقبل میں اَلجی کا استعمال غذائی مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عوام میں اَلجی کا استعمال ابھی عام نہیں ہو پایا ہے اور لوگ اس کے فوائد سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔

□□□

پتہ:
H 51, Dr. Iqbal Lane, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کا نام اردو ناول کے بنیادگزار کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔

انھوں نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام جیسے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ جو ایک عبوری دور سے گزر رہا تھا۔

قومی اردو کونسل نے نہایت ہی اہتمام اور صحیح متن کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔

صفحات: 225، قیمت: -/91 روپے

تنقیدی اور تہذیبی مطالعے

مصنف: طاہرہ پروین

اس کتاب میں اردو شعر و ادب اور خصوصاً نظیر، انیس، اقبال اور رشید جہاں کے حوالے سے ان کی تخلیقات میں مذہبی و تہذیبی امور پر پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں مصنفہ نے مذکورہ قلم کاروں کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے لفظیات کی تدریس اور عملی تنقید کا بھی سہارا لیا ہے۔

صفحات: 191، قیمت: -/93 روپے

اسعد فیصل فاروقی

گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج اور ہندوستان

آب و ہوا میں تبدیلی اور کرۂ ارض کے درجۂ حرارت میں مسلسل اضافے سے کرۂ ارض کو زبردست خطرات لاحق ہیں اور انسانیت کو مستقبل کے ان خطرات سے بچانے کے لیے مستقل کوششیں بھی جاری ہیں۔ تقریباً دس سال پہلے ایک بین الاقوامی ترینی The United Nation Framework Convention on Climate Change کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں زیادہ تر ممالک نے شمولیت اختیار کی اور اس مسئلے پر غور وفکر کیا کہ دنیا کے مختلف ممالک اس بڑھتی ہوئی گلوبل وارمنگ (ارضی حرارت) کو قدرتی سطح پر لانے کے لیے اپنے طور پر کیا کوشش کر سکتے ہیں۔ 1997 میں مختلف ممالک کی حکومتوں کی رضامندی سے جاپان کے قدیم دارالحکومت کیوٹو میں ایک ماحولیاتی معاہدہ عمل میں آیا جس کو "کیوٹو پروٹوکول" کے نام سے جانا گیا۔ کیوٹو پروٹوکول کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک اور خاص طور پر صنعتی ممالک سے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کے مسئلے پر مسلسل رابطہ رکھے اور ان کو اس بات پر رضامند کرے کہ وہ اپنے یہاں سے خارج کی جانے والی گرین ہاؤس گیسوں کو 2012 تک 1990 کے اپنے یہاں کے لیول سے 5.2 فیصدی کم کریں۔

16 فروری 2005 کو ارضی حرارت (گلوبل وارمنگ) کا یہ بین الاقوامی ماحولیاتی معاہدہ کیوٹو پروٹوکول آخرکار ہندوستان سمیت 141 ممالک پر جنھوں نے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے نافذ ہوگیا۔ یہ ممالک جو مشترکہ طور پر 55 فیصدی کل اخراج شدہ گیسوں کے ذمے دار ہیں۔

اس پروٹوکول میں CO_2 سمیت چار دوسری زہریلی گیسوں CH_4, N_2O, SF_6, HFCS کو کم کرنے کا ٹارگٹ رکھا گیا ہے۔

اس معاہدے کی بدنصیبی یہ رہی کہ دو بڑے ترقی یافتہ ممالک امریکہ (جو دنیا کا سب سے زیادہ آلودگی پھیلانے والا ملک ہے) اور آسٹریلیا نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت پر برا اثر پڑے گا اور اس میں چین اور ہندوستان جیسے ممالک کو زیادہ مراعات سے نوازا گیا ہے

اس معاہدے پر حالانکہ چین اور ہندوستان دونوں نے دستخط کیے ہیں، لیکن کیوٹو پروٹوکول کے مطابق یہ ممالک Late Industrialized ہیں، اس وجہ سے یہ ممالک 2012 تک اپنے CO_2 کے اخراج میں کمی لانے کے لیے پابند نہیں ہیں یعنی ان پر 5.2 فیصد CO_2 میں کمی لانے کی پابندی عائد نہیں ہوگی کیونکہ ترقی پذیر ممالک کو Late Industrialisation کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اسی وجہ سے اس معاہدے کو امریکہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔

ہندوستان کی ماحولیاتی حالت:

ہمارے لیے کیوٹو پروٹوکول پر عمل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ارضی حرارت (گلوبل وارمنگ) نے اپنے اثرات ہندوستان پر دکھانا شروع کر دیے ہیں۔ ہندوستان کی حرارت ہر صدی میں 0.57 ڈگری سلسیس کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ یہ 2050 تک 3.00 ڈگری بڑھ جائے گی۔ اس کی وجہ سے ہمالیائی گلیشیر ہر سال 30 میٹر Average rate کے حساب سے سکڑ رہا ہے۔ سیٹلائٹ ڈاٹا ہمیں یہ دکھا رہا ہے کہ مغربی ہمالیہ میں دس فیصدی گلیشیر پگھل چکے ہیں۔ اسی طرح سے مشرقی ہمالیہ میں 30 فیصدی گلیشیر میں کمی آئی ہے۔ ہمالیہ پر جمی ہوئی برف کا اس تیز رفتاری کے ساتھ پگھلنا ہمالیائی دریاؤں خاص طور پر گنگا، اطلیس اور برہم پتر پر برا اثر ڈالے گا جس کی وجہ سے اگلے آنے والے 35 سال میں ڈرامائی انداز میں ان دریاؤں کی آبی سطح بڑھ جائے گی اور طغیانی کی صورت حال پیدا ہوگی۔ سیلاب سے پورے ملک میں زبردست تباہی پھیلے گی پھر اچانک آبی سطح گھٹ جائے گی جس سے پانی کی زبردست قلت پیدا ہوگی، ملک میں سوکھا پڑے گا، کھیتی تباہ ہوجائے گی نتیجتاً اناج کی قلت پیدا ہوگی اور ساحلی علاقے سمندر کی سطح میں اضافہ ہونے کی وجہ سے مسلسل طوفان کی زد میں رہیں گے۔

خشک سالی اور طغیانی کی اس صورت حال سے مختلف امراض کو پھیلنے کا موقع ملے گا جس سے انسانی جانوں کی بقا کے لیے سنگین خطرات لاحق ہوجائیں گے اور ملک کی تقریباً 500 ملین آبادی متاثر ہوگی۔

ہندوستان کی ذمے داری:

ہندوستان کو اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر

ممالک کی طرف ہاتھ بڑھانا ہوگا اور ان کے ساتھ ساجھے داری قائم کرنا ہوگی تاکہ دنیا کو آب و ہوا کی تبدیلی اور درجۂ حرارت میں اضافے کے مضر اثرات سے نجات دلانے کے لیے کچھ مثبت اقدام کیے جاسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکے کہ کاربن کے اخراج کو قابل قبول حد تک رکھنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک اور ہندوستان کس طرح کی پہل کرسکتے ہیں تاکہ مؤثر طریقے سے دنیا کو مستقبل کی تباہی سے بچانے اور آنے والی نسلوں کی بقا کے لیے تدارکی اقدامات کیے جاسکیں۔

اس سلسلے میں ہمیں سنجیدگی اور کھلے ذہن کے ساتھ اپنے عوام کے لیے ایک ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا ہوگا جس سے گرین ہاؤس گیسوں کی روک تھام کے ساتھ مطابقت پیدا کی جاسکے اور ایسے اقدامات کیے جائیں جو ماحول پر اچھا اثر ڈالیں۔ ایسی توانائی کے وسائل کو استعمال میں لانا ہوگا جو صاف ستھری ہو جو موسم میں بڑھتے ہوئے عدم توازن کو کم کرسکتی ہو، اس میں قابل تجدید توانائی (Renewable Energies) اور High Efficiency بھی ہوسکتی ہیں۔ ایسی توانائی ہماری معیشت کے لیے فائدہ مند ہوگی علاوہ ازیں اس سے سماجی طور پر بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ مثال کے طور پر دیہی ترقی میں تیزی آئے گی، اندرونی اور بیرونی آلودگی اور اس سے متعلق بیماریوں میں کمی آئے گی اور غریبوں کو توانائی بھی آسانی سے دستیاب ہوجائے گی۔

کیوٹو پروٹوکول نے ہمیں ایک اہم موقع فراہم کیا ہے جس پر عمل کرکے ہم ماحول کے لیے اپنی ذمے داری کو آسانی کے ساتھ نبھاسکتے ہیں۔ اگر ایک طرف ترقی یافتہ ممالک کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ گرین ہاؤس گیسوں کے استعمال میں کمی لائیں تو دوسری طرف ہمارے ملک ہندوستان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایک نئی شروعات کرتے ہوئے Decarbonization کی طرف ایک اہم قدم اٹھائے اور Foosilfuels اور ہائیڈروکاربن کے استعمال میں کمی لائے، اس سے اس کی دنیا میں ایک منفرد پہچان بنے گی اور بین الاقوامی ماحول کو قدرتی میزان پر لانے کے لیے اس کی یہ پہل ایک اہم قدم ثابت ہوگی۔

حال ہی میں اسکاٹ لینڈ میں اختتام پذیر جی ایٹ اور پانچ ترقی پذیر ممالک کے اجلاس میں ماحولیاتی تغیرات پر ہونے والی گفت وشنید کا نتیجہ وہی نکلا جس کا سب کو اندیشہ تھا یعنی بش انتظامیہ کی غیر سنجیدگی اور لندن کے بم دھماکوں نے گفت وشنید کا رخ اصل مسئلے کے بجائے دہشت گردی کے خلاف لڑائی کی طرف موڑ دیا۔ اس موقع پر ہندوستانی وزیر اعظم نے ہندوستان کے سرکاری نظریے کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

ہندوستان نے اپنی بات رکھتے ہوئے کہا کہ قانون کے مطابق، صحیح تعاون اور صحیح طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ کثیر فریقی معاہدہ اور مختلف ممالک کی رضامندی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جو بھی اقدام کیے جائیں اور گفت وشنید ہو وہ کیوٹو پروٹوکول اور UNFCCC کے مطابق ہو کیونکہ بین الاقوامی آرا کو کیوٹو پروٹوکول اور UNFCCC ہی پیش کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بھی عملی اقدام کیے جائیں وہ بنیادی حقائق پر مبنی ہوں۔ ہر ملک کو ان بنیادی حقائق کو تسلیم کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ پوری دنیا ایک جیسے ماحولیاتی موسمی رد وبدل سے دوچار ہے، حالات بے حد سنگین ہیں اور یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ کوئی ایک ملک اس سے متاثر نہیں بلکہ سارے ممالک اس خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں اس لیے ضروری ہے کہ سب ممالک اس خطرناک صورت حال سے نپٹنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اقدام کریں۔ اس کی اہم ذمے داری ترقی یافتہ ممالک پر عائد ہے جو برسوں سے اخراج شدہ کاربن کا انبار لگا رہے ہیں اور ماحول کو آلودہ کررہے ہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اگر بین الاقوامی برادری موجودہ طریقۂ کار پر اصرار کرتی ہے جو ہٹ دھرمی، ناانصافی اور غیر سنجیدگی پر مبنی ہے تو اس مسئلے سے کسی بھی طرح سے نپٹا نہیں جاسکے گا۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ سارے ممالک مل بیٹھ کر اس سلسلے سے ایک اہم فیصلہ کریں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

ہندوستان میں فی کس اعتبار سے CO_2 کا اخراج بہت ہی کم مقدار میں ہوتا ہے۔ ہندوستان ان گنے چنے ممالک میں شامل ہے جن کے پاس قابل تجدید توانائی کے لیے ایک الگ وزارت ہے۔ ہمارے ملک نے جدید ماحول دوست توانائی اور ٹیکنالوجی پر بہت ہی اہم تحقیقی کام کیا ہے اور ہمارے ملک کا اعتماد ہے کہ ہندوستان کی ترقی ماحول کو نظرانداز کرکے نہیں ہوسکتی یعنی ہم اپنے ملک کی ترقی Enviommentally Sustainable طریقے سے چاہتے ہیں۔

ہندوستان کے پاس دو اہم پروگرام ہیں جن کے ذریعے ہم دو اہم توانائی کے سرچشموں کی تجدید کریں گے وہ ہیں ہائیڈرو الیکٹرک پاور اور نیوکلیئر پاور۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کو اپنے فنڈ ان بڑے ہائیڈرو پاور پروجیکٹ پر خرچ کرنا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Allah Wali Kothi,
Doodpur, Civil Lina,
Aligarh-202002 (U.P.)

امیر بانو

ریبیز — ایک مہلک مرض

ریبیز ایک خطرناک اور جان لیوا مرض ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے پر موت یقینی ہے کیونکہ میڈیکل سائنس کے میدان میں تمام تر ترقی کے باوجود آج بھی اس مرض کا کوئی علاج دریافت نہیں کیا جاسکا ہے۔ صرف بچاؤ ہی اس مرض کا واحد علاج ہے۔ یہ مرض جانوروں کو ہوتا ہے لیکن جب اس مرض سے متاثرہ کوئی جانور کسی انسان کو کاٹتا ہے تو وہ بھی اس مرض کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ کسی بھی کتے کے کاٹنے سے انسان کو یہ مرض اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ پاگل ہوکر ہلاک ہوجاتا ہے۔ ایسا تبھی ہوتا ہے جب کاٹنے والا کتا یا کوئی دوسرا جانور ریبیز مرض سے متاثر ہو۔

یہ مرض پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے لوگ زیادہ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ تو صحت کی پروا کرتے ہیں، نہ کتے کے کاٹنے پر ضروری تدارکی تدابیر اختیار کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس خطرناک مرض کا شکار ہوکر اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں صحت کے بنیادی اصولوں سے واقفیت عام ہے، اور لوگ اپنی صحت وتندرستی کا خیال رکھتے ہیں اس لیے وہ ہر ممکن احتیاط برتتے ہیں۔ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ دنیا میں تقریباً ہر سال 40 لاکھ لوگ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں اور ان میں سے 60 ہزار لوگ تعمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی تقریباً 10 ہزار لوگ ہر سال اس مرض میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوجاتے ہیں۔

مرض کیسے پھیلتا ہے؟

اس مرض کا سبب ایک وائرس ہوتا ہے جسے ریبڈ وائرس کہتے ہیں۔ یہ وائرس کتے، سیار، اور بھیڑیے وغیرہ میں ایک سے دوسرے میں پھیلتے رہتے ہیں۔ جب اس مرض سے متاثرہ کوئی جانور کسی انسان کو کاٹتا ہے تو اس کی رال میں موجود وائرس انسان کے جسم میں داخل ہوجاتے ہیں جہاں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر یہ وائرس دماغ تک رسائی حاصل کرلیتے ہیں۔ وائرس کے دماغ تک پہنچنے کے بعد ہی مرض کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔

جانوروں میں کتا، بھیڑیا، لومڑی، بلی، گھوڑا، گائے، نیولا اور چمگادڑ کے کاٹنے سے یہ مرض انسان کو ہوتا ہے۔ ویسے زیادہ تر پاگل کتوں کے کاٹنے سے ہی انسان اس مرض کی گرفت میں آتا ہے کیونکہ کتا ہی انسان کے زیادہ قریب رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں آوارہ کتوں پر کوئی پابندی نہیں ہے جس کے سبب ہر گلی کوچے میں کتے گھومتے رہتے ہیں۔

انسان کے جسم پر لگی چوٹ، کھرونچ اور زخم پر متاثرہ کتے کی لار لگ جانے سے بھی یہ مرض ہوجاتا ہے کیونکہ کتوں کو اپنے ناخن چاٹنے کی عادت ہوتی ہے جس کی وجہ سے مرض کے وائرس ناخنوں میں پہنچ جاتے ہیں اور جب ناخنوں سے وہ انسانوں کو کھرونچ دے تو اس سے بھی وائرس انسان کے زخم میں پہنچ کر جسم میں داخل ہوجاتے ہیں۔

مرض کی علامات کب ظاہر ہوتی ہیں؟

مرض کی علامات ظاہر ہونے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کتے نے جسم کے کس حصے پر کاٹا ہے؟ وائرس کتنی تعداد میں جسم میں پہنچتے ہیں اور کاٹنے کے بعد متاثرہ شخص نے زخم کو صاف اور پاک کرنے کی کیا تدابیر کی ہیں۔ کتا اگر جسم کے اوپری حصے پر کاٹتا ہے تو مرض کی علامات جلد ظاہر ہوجاتی ہیں اور اگر نچلے حصے میں کاٹتا ہے تو دیر ہوتی ہے کیونکہ اوپری حصے سے وائرس جلد دماغ تک پہنچ جاتے ہیں اور نچلے حصے سے دماغ تک پہنچنے میں وائرس کو تاخیر ہوتی ہے اس لیے مرض کی علامات بھی دیر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر زخم میں رال کی مقدار کم ہوتی ہے اور کاٹنے کے بعد زخم کو خوب اچھی طرح دھو دیا گیا ہے تو بہت حد تک وائرس نکل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مرض کا زور بھی کم ہوتا ہے اور علامات کے ظاہر ہونے میں بھی دیر ہوتی ہے۔ اسی لیے کتے کے کاٹنے کے کتنے دنوں کے بعد علامات ظاہر ہوں گی، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عموماً علامات کے ظاہر ہونے میں کچھ دنوں سے لے کر سال بھر یا اس سے بھی زائد عرصہ لگ جاتا ہے۔ اسی عرصے کو مدت حضانت کہتے ہیں۔

اس مرض کی علامات کیا ہیں؟

ابتدا میں مریض سست ہوجاتا ہے، ہاتھ پیر میں درد ہونے لگتا ہے۔ کاٹی ہوئی جگہ پر جلن اور درد محسوس ہونے لگتا ہے، کبھی کبھی بخار بھی آجاتا ہے، مریض نفسیاتی دباؤ میں رہتا ہے، وہ تنہائی پسند ہوجاتا ہے، مزاج میں چڑچڑاپن اور آواز میں بھاری پن آجاتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کے منہ سے کتے کے بھونکنے جیسی آواز بھی نکلنے لگتی ہے۔ مریض بے چین ہوجاتا ہے، چہرہ خوف ناک ہوجاتا ہے، تشنجی دورے پڑنے لگتے ہیں، سانس لینے اور کسی چیز کو نگلنے میں بھی دشواری ہونے لگتی ہے، مریض کھانے پینے سے بے پروا ہوجاتا ہے، شدید پیاس معلوم ہوتی ہے لیکن تشنج کے سبب وہ پانی پینے میں سخت اذیت محسوس کرتا ہے۔ منہ میں لعاب بھرا رہتا ہے جس کو نگلنے کے لیے وہ عجیب وغریب انداز

سے کھانستا ہے، اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ کبھی وہ بے وجہ چیخنے چلانے لگتا ہے اور دوسروں پر حملہ آور ہونے لگتا ہے۔ آخری مرحلے میں تشنج کی علامات ختم ہوجاتی ہیں، عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اعصاب کمزور ہوجاتے ہیں اور مریض کوما کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر دم گھٹنے اور حرکت قلب بند ہوجانے سے اس کی موت ہوجاتی ہے۔

پاگل کتے کی پہچان کیا ہے؟

جب کوئی کتا یا جانور ریبیز سے متاثر ہوجاتا ہے تو اس میں درج ذیل تبدیلیاں نظر آنے لگتی ہیں:

وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، ہر وقت غصے میں رہتا ہے، بے وجہ بھونکنے لگتا ہے، ہر چیز کی طرف جھپٹنے لگتا ہے، بے مقصد آبادی سے دور نکل جاتا ہے، بے سبب دوسروں پر حملہ کرنے لگتا ہے، منہ سے جھاگ نکلتی رہتی ہے، آواز خوف ناک ہوجاتی ہے، پیروں پر فالج کا اثر ہوجاتا ہے، آخر میں پورا جسم مفلوج ہوجاتا ہے اور اس کی موت ہوجاتی ہے۔

کتے کے کاٹنے پر کیا کریں؟

صابن سے خوب اچھی طرح کئی بار دھوئیں، زخم صاف کرنے کے بعد کاربولک ایسڈ لگائیں، احتیاطی طور پر ٹیٹنس کا ٹیکہ لگوائیں، زخم اگر بڑا ہو تو اینٹی بائیوٹک دواؤں کا استعمال کریں اور مریض کو ہسپتال لے جائیں۔

اس مرض کا چونکہ اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوسکا ہے اس لیے بچاؤ کر کے ہی اس خوفناک مرض سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اگر کتا یا کوئی جانور جسے ریبیز کا مرض ہو، وہ کاٹ لے تو سب سے پہلے حفاظتی اقدامات کریں، اس کے بعد کتے پر نگاہ رکھیں۔ اگر کتا کھلے پڑوں کا ہے اور اس کی نگرانی کرسکتے ہیں تو پہلے یہ معلوم کریں کہ کتے کو اینٹی ریبیز ویکسین لگی ہے یا نہیں؟ اگر لگی ہے تو بے فکر ہوجائیں اور اگر نہیں لگی ہے تو کتے پر توجہ دیں اور یہ دیکھیں کہ وہ دس دنوں کے اندر از خود مرجاتا ہے یا نہیں؟ اگر مرجاتا ہے تو فوراً معالج سے رجوع کر کے انجکشن لگوائیں اور اگر کاٹنے کے دس دنوں تک وہ نہیں مرتا تو بھی بے فکر ہوجائیں۔ اکثر لوگ کتے کے کاٹنے پر غصے میں آکر اس کو مار ڈالتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ پھر یہ معلوم کرنا ناممکن ہوجائے گا کہ کتا ریبیز زدہ تھا یا نہیں؟ اگر کتا کسی دوسری جگہ کا ہو یا خود کسی دوسری جگہ گئے ہوں اور وہاں کتے نے کاٹ لیا ہو تو بلاتاخیر انجکشن لگوالیں کیونکہ کتا آپ کے لیے انجان ہے اور اس پر نگاہ رکھنا محال ہے۔

اس مرض کا علاج کیا ہے؟

اس مرض سے بچاؤ کے لیے دو طرح کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ ایک ٹیکہ وہ ہے جو احتیاطی طور پر کسی بھی جانور کے کاٹنے سے پہلے ہی لگوالیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکہ ان لوگوں کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے جن کا جانوروں سے رابطہ رہتا ہے جیسے جانوروں کے ڈاکٹر وغیرہ۔ دوسرا ٹیکہ وہ ہے جو جانور کے کاٹنے کے بعد لگوایا جاتا ہے تاکہ مرض کا اثر نہ ہو۔ جو ٹیکہ کتا یا دیگر جانوروں کے کاٹنے سے پہلے لگتا ہے وہ تین بار 0-7-21 دنوں کے وقفے پر لگتا ہے اور بوسٹر ڈوز ایک سال بعد دیا جاتا ہے۔

کچھ مدت پہلے تک ہمارے ملک میں صرف ایک ہی طرح کا ٹیکہ موجود تھا جو بھیڑ کے دماغ سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے چودہ ٹیکے پیٹ کی چربی میں لگتے ہیں لیکن یہ ٹیکے انتہائی تکلیف دہ بھی ہیں اور اس کے مضر اثرات بھی ہیں۔ یہ ٹیکے سرکاری ہسپتالوں میں مفت لگائے جاتے ہیں۔

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بازار میں نئے نئے ٹیکے دستیاب ہیں۔ جن میں ہیومن ڈپلائی سیل ویکسین، پیوری فائیڈ چک، ڈک ایمبریو سیل ویکسن وپیوروفائیڈ ویرو سیل ویکسن پوری طرح محفوظ ہونے کے سبب زیادہ مروج ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ٹیکہ لگوا کر مرض سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ یہ ٹیکے 0-3-14-28 دنوں کے وقفے پر لگتے ہیں۔ یہ ٹیکے جو بازار میں عام طور پر دستیاب ہیں ہاتھ میں لگائے جاتے ہیں۔ ان ٹیکوں کے لگوالینے سے پھر ریبیز ہونے کا خطرہ نہیں رہ جاتا ہے۔

□□□

پتہ:
Vill-Neem Sarai,
Po. Dhooman Ganj, Allahabad (U.P.)

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ھیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ھم سب کا فرضِ اولیں ھے۔

سلیم صدیقی

احمد فراز سے بات چیت

مشاعرے ہماری تاریخی اور تہذیبی روایت کا بیش قیمت حصہ ہیں جنھیں برقرار رکھنا چاہیے۔ ان کی وجہ سے نئی نسل میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور مشاعروں نے اردو زبان کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار برصغیر کے معروف شاعر احمد فراز نے ایک خصوصی بات چیت کے دوران کیا۔

حال ہی میں مشاعرہ جشن بہار میں شرکت کے لیے دہلی آئے احمد فراز نے ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کے مستقبل سے متعلق سوال کے جواب میں کہا کہ زبانیں کبھی مرتی نہیں ہیں البتہ ان پر دوسری زبانیں اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں انگریزی کا چلن بڑھا ہے لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبان سے رشتہ نہ توڑیں۔ انھوں نے اس بات کو غلط بتایا کہ پاکستان میں قومی زبان ہونے کے باوجود اردو پر علاقائی زبانیں حاوی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ کی سرکاری زبان ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ لوگ اپنی اپنی علاقائی زبانیں بھی بولتے ہیں۔ جہاں تک بات اردو کے مستقبل کی ہے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ خطرہ ہے، کیونکہ اردو زبان سے یہ بھی ایک طرح کی دشمنی ہے کہ ہندوستان میں عربی اور فارسی کے الفاظ سے اردو کو دور کیا جا رہا ہے تو پاکستان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے۔ ایسا کر کے اردو کے دامن کو تنگ کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ شاعری سے متعلق سوال پر انھوں نے قدرے محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دونوں ہی ملکوں میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا حالانکہ دونوں جگہ حالات سازگار ہیں۔ اس سوال پر کہ آپ کی نظر میں اس دور کا بڑا شاعر کون ہے؟ احمد فراز نے کہا کہ شاعر مچھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا اور اچھے ادیب اور شاعر ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں احتجاجی شاعری کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں احتجاجی شاعری ہو رہی ہے کیونکہ پوری قوم شاعروں سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ان کے مسائل اور ان کی بات کو اٹھائیں۔ احمد فراز نے کہا کہ حال ہی میں انھوں نے حکومت کو اپنے ایوارڈ بھی واپس کر دیے ہیں۔

موجودہ دور میں شاعری کے مزاج میں آئی تبدیلی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہر دور میں ادب میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر دور کی شاعری کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر دور میں شیکسپیئر اور کیٹس پیدا نہیں ہوتے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ نئی نسل کی شاعری کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ نئی نسل بھی اچھی شاعری کر رہی ہے لیکن انھوں نے کسی کا نام لینے سے گریز کیا۔ موجودہ دور کی شاعری میں خواتین کے رول کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ خواتین میں اس دور میں کئی بولڈ رائٹر اور شاعرات سامنے آئی ہیں جن کا ادب میں اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر پروین شاکر، ادا جعفری اور فہمیدہ ریاض کے نام بھی لیے۔ اس سوال پر کہ لوگوں کو آپ سے شکایت ہے کہ آپ بہت سال سے اپنا پرانا کلام ہی سنا رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں نیا کلام کون سناتا ہے؟ میں تو پھر بھی کافی نیا سناتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ یا تو اچھی شاعری کی توقع رکھیں یا بہت سی شاعری کی۔ شاعری بہت زیادہ ہوگی تو اچھی نہیں ہوگی۔

پاکستان میں ''تنقید'' بے حد کمزور کیوں ہے؟ اس سوال پر انھوں نے کہا کہ ہر جگہ ہر چیز اچھی نہیں ہوتی۔ آپ کے یہاں تنقید بہت اچھی ہے تو ہمارے یہاں شاعری اور افسانے بہت اچھے لکھے جا رہے ہیں لیکن فقاد اچھے نہیں ہیں۔ اسی طرح آپ کے یہاں فلمیں بہت اچھی ہیں ہمارے یہاں ڈرامے بہت اچھے بنتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں مشاعروں کی اہمیت سے متعلق سوال پر احمد فراز نے کہا کہ مشاعرے ہماری تاریخی اور تہذیبی روایت کا بیش قیمت حصہ ہیں۔ ان کی وجہ سے نئی نسل میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور مشاعروں نے اردو زبان کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پہلے مشاعروں میں سیکڑوں سامعین آتے تھے، اب ہزاروں میں آتے ہیں۔ مشاعروں کے روز افزوں گرتے معیار کے لیے انھوں نے شعرا کو ذمے دار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اچھی شاعری کو داد مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہندوستان میں بعض شاعر کہہ کر داد مانگتے ہیں یہ سب پاکستان میں نہیں ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت کے بارے میں وہاں کے ادیبوں کا کیا رویہ ہے؟ اس سوال پر احمد فراز نے کہا کہ تانا شاہ سے کون خوش ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کسی کا نام لیے بغیر کہا کہ جب فوجی جنرل ریٹائر ہونے والے ہوتے ہیں تو فوج کی طاقت سے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں لیکن اس بار اس فوجی حکومت کا ایسا حشر ہوگا کہ آئندہ کوئی فوجی جنرل ایسا نہیں کرے گا۔ حال ہی میں اسلام آباد میں پیش آئے لال مسجد سانحے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں

ایک شاعر ہوں۔ اس معاملے کو سیاسی نظر سے دیکھنے کے بجائے اس نظر سے دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنے انسان مارے گئے۔ ہمارا کہنا ہے کہ اگر کوئی مجرم ہے تو اس کا جرم پہلے عدالت میں ثابت کرو پھر سزا دو نہ یہ کہ کسی کو گولیوں سے بھون ڈالو۔ لال مسجد کا سانحہ مشرف حکومت کی نااہلی کے سبب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو خود مشرف سرکار کے خلاف تحریک میں شامل رہا ہوں۔ فوجی حکومت سے کوئی ادیب اور حساس شخص کیسے مطمئن ہوسکتا ہے۔ اس سوال پر کہ آج دنیا بھر میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک مہم جاری ہے۔ انھیں دہشت گرد بتایا جارہا ہے، احمد فراز نے کہا کہ جہاں تک بات دہشت گردی کی ہے تو طالبان امریکہ نے پیدا کیے اور پاکستان میں تانا شاہ بھی امریکہ کی ہی پیداوار ہیں۔ اس کے باوجود آج دنیا بھر میں جو صورت حال ہے اس میں مسلمانوں کو اپنے آپ کو تھوڑا سا بدلنا ہوگا اور اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات پہلے کے مقابلے میں کافی اچھے ہوئے ہیں، ان میں بہتری آئی ہے لیکن ابھی کافی گنجائش باقی ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام میں محبت ہے بھلے ہی حکومتوں میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ترقی کررہا ہے یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔ پرتبھا پاٹل کے صدر منتخب ہونے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ ایک اچھا اور مثبت قدم ہے۔ کشمیر کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کشمیر کا ایشو دبا نہیں فی الحال صرف منظر سے ہٹا ہے۔ دونوں کے درمیان مذاکرات جاری ہیں۔ اللہ کرے کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے۔ کچھ سیاستدانوں کی اس تجویز پر کہ دونوں ملکوں کو حقیقی کنٹرول لائن کو ہی بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلینا چاہیے، احمد فراز نے کہا کہ اگر یہی کرنا تھا تو 60 سال تک ٹکراؤ اور کشیدگی کا ماحول کیوں بنائے رکھا گیا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ یہ سب سیاستدانوں کا کام ہے ہمارا کام تو محبتیں بانٹنا ہے اور ہم اپنا کام کررہے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی، 7 اگست 2007)

□□□

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کرکے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کردی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

نشاط روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایہام و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

عبدالعلیم قدوائی

کرنے کے کام

ہمارے ملک کو آزادی ملے ہوئے ساٹھ سال ہوا چاہتے ہیں اور ابھی سے گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ ہر ترقی پذیر ملک کی طرح اسے ان گنت دشواریوں پر قابو پانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں اصل ذمے داری حکومت کی ہے مگر عوامی جمہوری نظام میں لوگوں کا تعاون اور اشتراک لازمی ہے۔ قومی سطح پر قانون کی بالادستی قائم رکھنا اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا سب سے مقدم باتیں ہیں۔ کوئی بھی ملک صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک وہاں علاقائی نابرابری، معاشی اونچ نیچ، سماجی تعلیمی پسماندگی برقرار رہتی ہے اور قطار کے آخری آدمی تک کو ضروریات زندگی آسانی سے نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت معاشی، تعلیمی اور سماجی پچھڑے پن کے تہرے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس بحران کو دور کرنے کے لیے سرکار جو قدم اٹھا رہی ہے، ایک تو وہ ناکافی ہیں، دوسرے ان کے نفاذ میں بہت زیادہ تاخیر ہوتی ہے اور اس پر رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کی وجہ سے ان کی افادیت بھی بہت کم رہ جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے شہری، رضاکار تنظیمیں، میڈیا سب مل کر عملی اور مثبت کام کریں۔

معاشی پسماندگی دور کرنے کے لیے حکومت نے متعدد پروگرام بنائے ہیں، افسوس ہے کہ اقلیت کے افراد ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں جس کی بڑی وجہ ان کی ناواقفیت، تعلیمی پسماندگی اور پنگچوامٹ ہے۔ چھوٹی صنعتوں، دستکاریوں، گھریلو دھندوں اور خدمات پیش کرنے والی اکائیوں کے ذریعے معاشی بدحالی کو بڑی حد تک دور کیا جاسکتا ہے اور اس میدان میں ہنرمندی او رکام کی لیاقت کی اقلیت میں کمی نہیں۔ مراد آباد، فیروز آباد، بھدوہی، سہارنپور، حیدرآباد، مہاراشٹر، کیرالا وغیرہ میں خاصی تعداد میں صنعتی اکائیاں تجربہ کار کاریگروں کی مدد سے چل رہی ہیں مگر اس دائرے میں ابھی وافر گنجائش توسیع وتجدید کی ہے جس کے لیے ملت کو خود ہاتھ پیر مارنا چاہیے۔ ضروری معلومات فراہم کرانے کے مراکز مختلف جگہوں پر کھول کر چھوٹی صنعتوں اور دستکاریوں اور سروسنگ اکائیوں کا جال ملک کے طول وعرض میں پھیلایا جاسکتا ہے جس کے لیے بہت زیادہ سرمایہ یا مشینری درکار نہیں اور جو آسانی سے کہیں بھی کھولی جاسکتی ہیں اور ملک کی اندرونی مانگ کے علاوہ برآمدی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ قابل ذکر بات ہے کہ ہمارے ملک میں چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کا پروگرام تقریباً پچپن سال پہلے شروع کیا گیا جو یہاں بہت کامیاب اور مقبول ہوا اور آج بھی ملک کی معیشت کا ایک اہم حصہ ہے۔ بے روزگار نوجوان، معذور وسکدوش افراد، خواتین، کاشتکار، مزدور سب ہی اپنے خالی وقت میں اس ذریعے سے اچھا خاصا کما سکتے ہیں۔ وزیراعظم یوجنا اور حال میں چلائی گئی دیہی روزگار کی اسکیم سے خاصا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ معلوماتی مرکزوں کے علاوہ اخبارات، رضاکار تنظیمیں اور تعلیمی ادارے ایسے پروگراموں کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی کرکے ان کو عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ روٹری کلب چیمبر آف کامرس اور اسی قسم کے دوسرے فلاحی ادارے بھی یہ کام ایک مشن کے طور پر آسانی سے کرسکتے ہیں کیونکہ اس سے پورے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے گا۔

معاشی پسماندگی ہی کی طرح تعلیمی پسماندگی بھی ہمارا بڑا قومی المیہ ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی کے عبقری دور میں یہ تصور کہ مسلمانوں کی صرف ایک تہائی آبادی پڑھی لکھی ہے کم حیرتناک نہیں۔ پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام ضروریات سے بہت کم اور ناقص ہے۔ اچھے اسکولوں، کالجوں اور استادوں کی کمی کے ساتھ ساتھ والدین کی غفلت بگڑے ہوئے گھریلو اور مقامی ماحول کی وجہ سے صورت حال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ ٹیکنیکل تعلیم یعنی پیشہ ورانہ تربیت کی سہولتیں بھی کم ہیں جس کی وجہ سے معاشی وسماجی اعتبار سے اقلیتی افراد دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ صورت حال شمالی ہند کی خاص طور پر زیادہ تشویش ناک ہے جہاں تعلیم کے سلسلے کو بیچ میں منقطع کردینے، لڑکیوں کو اسکول بھیجنے سے غفلت اور تعلیمی معیار کی پستی عام ہے جس کی وجہ سے ملازمتوں، صنعت وحرفت اور تعلیم کے میدان میں اقلیت اپنی خاطر خواہ جگہ حاصل نہیں کرسکی ہے۔ البتہ امید افزا بات یہ ہے کہ صورت حال کی سنگینی کا احساس کیا جارہا ہے اور سید حامد، ڈاکٹر اسحاق مجنانہ والا، محمد اسحاق، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر عبدالکریم نائیک، سید عارف الدین اور سیطے عبدالقادر جیسے دردمند حضرات کی کوششوں سے صورتحال میں امید افزا تبدیلی ہورہی ہے۔

انجمن اسلام، الامین، مدینہ سوسائٹی، ڈاکٹر حامد علی ٹرسٹ اور عابد علی خاں ٹرسٹ وغیرہ جیسے متعدد ادارے خصوص خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہم سب کے کرنے کا کام ہے کہ ان افراد اور اداروں کے نقش قدم پر چلیں اور اپنے محدود وسائل کے اندر تعلیمی کارواں کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں دینی مدارس کا ذکر بھی ناگزیر ہے جو بہت بڑی تعداد میں ہمارے ملک میں قائم ہیں اور بڑی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس کے ذریعے غیر رسمی تعلیم کو دور دراز کے علاقوں میں کم خرچ پر پھیلایا جاسکتا ہے۔ معاشی و تعلیمی پسماندگی کے ساتھ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ سماجی پسماندگی اور برائیوں کے خلاف علم جہاد بلند کریں اور معاشرے کو ان تمام خرابیوں سے نجات دلائیں جو گھن کی طرح اس کو کھائے جارہی ہیں۔ یہ خدمت کوئی معمولی نہیں بلکہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ان تینوں کاموں کے لیے دانشوروں، سماجی کارکنوں، باصلاحیت افراد اور رضا کار تنظیموں کو مل جل کر لگن اور مستعدی سے برسر کار ہونا چاہیے کیونکہ یہ قانون قدرت ہے کہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتی جب تک وہ خود اپنے کو نہیں بدلتی۔

کوچنگ سنٹر، معلوماتی مراکز، اردو میڈیم اسکول اور صنعتی و حرفتی تربیتی سنٹر وغیرہ قائم کرکے ملک میں سازگار ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے اور صنعت و حرفت، ملازمت، تجارت اور روزگار کے میدانوں میں پیش رفت کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم اوقاف سرمایہ کاری میں اہم اور مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں۔ دکانوں، مکانوں اور صنعتی بستیوں کے کامپلکس بھی اس قسم کے تعمیری کاموں میں بڑے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Zahedah Manzil, 4/873,
New Friends Colony, Aligarh (U.P.)

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاص وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اے. این. شبلی

آرکیالوجی میں کیریئر

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں دوسرے ملکوں کی بہ نسبت تاریخی علاقوں، مندروں اور مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مختلف بادشاہوں نے اپنے اپنے وقت میں مختلف مقاصد سے مختلف عمارتیں بنوائیں۔ اس زمانے میں تو ان عمارتوں کی اہمیت تھی ہی آج بھی ان کی اہمیت کم نہیں ہے۔ اب ہماری یہ ذمے داری ہے کہ ان تاریخی عمارتوں کی حفاظت کریں۔

آرکیالوجی کا شعبہ تاریخی عمارتوں کی حفاظت کے لیے کام کرتا ہے۔ حال میں ایودھیا کا مسئلہ سلجھانے کے لیے آرکیالوجی سروے آف انڈیا (ASI) کی بڑی مدد لی گئی ہے۔ آرکیالوجی ایک ایسا شعبہ ہے جس کی طرف عام طور پر طالب علموں کا دھیان کم ہی جاتا ہے جبکہ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں دلچسپی کے ساتھ ساتھ آمدنی کے بھی خاصے وسائل ہیں۔ اس شعبے سے وابستگی کے بعد تاریخی عمارتوں کے ساتھ وقت گزارنے کا اپنا ایک الگ ہی لطف ہے۔ اس شعبے میں صرف تاریخی عمارتوں کی حفاظت یا کھنڈرات کی کھدائی کا کام ہی نہیں ہوتا بلکہ ان عمارتوں کے بارے میں ملک اور ملک کے باہر کے لوگوں کو معلومات حاصل کرانا بھی اس کا کام ہے۔ کسی بھی ملک کے لیے وہاں موجود پرانی عمارتوں کو بچا کر رکھنے کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے آرکیالوجسٹ کی اہمیت بھی مسلم ہے۔

آرکیالوجی کے کورس ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں کرائے جاتے ہیں۔ یہ کورس ڈپلوما، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح کے ہوتے ہیں۔ بھارت سرکار نے بھی اس تعلق سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا صدر دفتر دلی میں ہے۔ یہاں آرکیالوجی میں پوسٹ گریجویٹ کورس کرایا جاتا ہے جس کی مدت دو سال کی ہے۔ جن طالب علموں نے Medival یا Ancient Indian History کے ساتھ ایم.اے. کیا ہو وہ اس کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ داخلہ تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہاں دوسرے کم مدت والے کورس بھی کرائے جاتے ہیں۔

دلی میں دلی سرکار کا قائم کردہ ادارہ Delhi Institute of Heritage Research and Management کافی مشہور ہے۔ یہاں دو طرح کے کورس کرائے جاتے ہیں۔ پہلا Master in Archaeology and Heritage Management اور دوسرا Master in Consenation Preservation and Heritage Management

اس ادارے میں مندرجہ بالا کورسوں کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ، ڈپلوما اور پی.ایچ.ڈی. کورس بھی کرائے جاتے ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ کورس چار سیشن میں پورا ہوتا ہے۔ پہلے سیشن میں ہندوستان کی تاریخی وراثت، دوسرے سیشن میں تاریخی وراثت کے تعلق سے ٹورزم، تیسرے میں ہندوستانی تہذیب اور چوتھے میں تاریخی عمارتوں کی حفاظت کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ کورس کے دوران ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرایا جاتا ہے اور وہاں موجود تاریخی عمارتوں سے واقفیت کرائی جاتی ہے۔

مواقع: آرکیالوجی کا کورس کرنے کے بعد روزگار کے مواقع کی کمی نہیں ہے۔ اس سبجیکٹ میں اساتذہ کے طور پر تو کیریئر بنایا ہی جاسکتا ہے ساتھ ہی Archaeological Survey of India (ASI) میں بھی مختلف عہدوں پر نوکری مل سکتی ہے۔ چونکہ اس سبجیکٹ میں امیدواروں کی بھیڑ کم ہے اس لیے نوکری ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ملک میں ایسے اداروں کی کمی نہیں ہے جو آرکیالوجی کورس کراتے ہیں۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق ان میں سے کسی کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ یہاں کچھ کے نام دیے جارہے ہیں۔

آرکیالوجی سروے آف انڈیا، 24، تلک مارگ، نئی دہلی-110001

دہلی انسٹی ٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ اینڈ مینجمنٹ، A-18، سیکٹر وہار، قطب انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی-110067

منگلور یونیورسٹی، منگلور-574199

میسور یونیورسٹی، کروفارڈ ہال، میسور-570005

انّاملائی یونیورسٹی، انّاملائی نگر-608002

گاندھی گرام رورل انسٹی ٹیوٹ، گاندھی گرام-624302

مدراس یونیورسٹی، چیپوک، چینئی-600005

گجرات یونیورسٹی، نارنگ پورہ، احمد آباد

گجرات وِدیاپیٹھ، آشرم روڈ، احمد آباد

ایم.ایس. یونیورسٹی آف بڑودرہ، فتح گنج، وڈودرہ-390002

ڈاکٹر ہری سنگھ گوڑ یونیورسٹی ساگر، مدھیہ پردیش-470003

رانی درگاوتی یونیورسٹی، سرسوتی وہار، جبلپور-482001

جیواجی یونیورسٹی، گوالیار-474011

پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ-80005
انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف آرٹ کنزرویشن اینڈ موسیولوجی، جتھتھ،
نیشنل میوزیم، نئی دہلی-110001
مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد
بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، یوپی
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، یوپی
کولکاتا یونیورسٹی، کولکاتا، ویسٹ بنگال
پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ، پنجاب
ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، مہاراشٹرا
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، اے۔ پی۔
پوروانچل یونیورسٹی، جونپور، یو۔ پی۔

□□□

پتہ:
Azad Features
E-3, Abul Fazal Enclave,
New Delhi-110025

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہندایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/مترجم: فضل حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

سالِ رواں کا سب سے بڑا ادبی سانحہ

قرۃ العین حیدر کا انتقال

اس شمارے کی کاپیاں پریس جا چکی تھیں جب یہ اندوہناک خبر ملی کہ نوئیڈا کے ایک اسپتال میں جہاں انھیں کچھ دن پہلے داخل کیا گیا تھا محترمہ قرۃ العین حیدر کا انتقال ہوگیا۔ ان کی رہائش پچھلے کچھ برس سے نوئیڈا ہی میں تھی۔ خبر ملتے ہی قومی اردو کونسل کے دفتر میں تعزیتی میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ قرۃ العین حیدر کی موت کو اردو فکشن کی ایک زندہ روایت کے خاتمے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں تاریخ و تہذیب کے نئے پرانے رشتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو سعی بلیغ کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ عینی آپا کی تحریروں میں پوری انسانی تاریخ کی معنی خیز جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ انفرادی حوالے بھی ان کے ہاں اجتماعی حوالے بن جاتے ہیں اور اگر وہ آپ بیتی بھی بیان کریں تو جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اردو کونسل کے لیے فخر کی بات ہے کہ اس نے حال ہی میں چار جلدوں میں ان کے افسانے شائع کیے ہیں جن میں ان کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو اب تک ان کی کسی کتاب میں نہیں آئے ہیں۔

آخر میں قرارداد تعزیت پاس کی گئی اور شرکا نے دو منٹ خاموش کھڑے رہ کر مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

قرارداد

قرۃ العین حیدر کو ان کے عہد میں اردو فکشن کی سب سے بڑی شخصیت کہا جائے تو درست ہوگا۔ آزادی کے بعد کے پورے برصغیر بلکہ پوری اردو دنیا میں جو نام ادبی وزن و وقار کی ضمانت بنے رہے ان میں عینی آپا کا نام بہت ممتاز تھا۔ انھوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب نیز ہند/ایرانی تہذیب کو جس خوبصورتی، خلوص اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ اپنی تحریروں میں سمویا ہے، وہ انھی کا حصہ تھا۔ یوں تو ان کی بیشتر تحریریں جن میں ان کا سوانحی ناول ''کار جہاں دراز ہے'' بھی شامل ہے ان کے تاریخی اور تہذیبی شعور کا آئینہ ہیں لیکن ان کا مشہور ترین ناول ''آگ کا دریا'' ان کی وسعتِ مطالعہ، حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل سے ان کی باخبری اور ان کی بے پناہ قوتِ بیانیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ ان کی موت کو فکر و فن کی ایک زندہ اور متحرک روایت کی موت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

● ''اردو دنیا'' کا اگلا شمارہ قرۃ العین حیدر نمبر ہوگا جس میں ان کے فکر و فن کی مختلف جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان کی کچھ منتخب نگارشات بھی پیش کی جائیں گی۔

حکیم نجم الغنی خاں نجمی

(ہماری مطبوعات سے)

شعر کی تعریف میں

شعر کے معنی لغت میں جاننے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کلام موزوں کا نام ہے جو اوزانِ مقررہ میں سے کسی وزن پر ہو اور مقفّٰی ہو اور بالقصد موزوں کیا گیا ہو۔ پس یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر ایک کلمہ کسی رکن کے وزن پر ہو یا کلام ہو مگر موزوں نہ ہو یا کلام موزوں ہو مگر مقفّٰی نہ ہو یا کلامِ موزوں بالقصد نہ موزوں کیا گیا ہو وہ اصطلاح کے موافق شعر نہیں ہے اور شاعر کے لغوی معنی جاننے والے کے ہیں اور اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو برائی بھلائی بحر و وزن و تقطیع و قافیہ وغیرہ لوازم شعر کو جانتا ہو۔ پس جو شخص ان لوازم شعری سے خبردار نہ ہوگا گو طبع موزوں رکھتا ہو اس کو شاعر نہ کہنا چاہیے۔ حالی اپنی کلیات کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول۔ جس طرح راگ فی حد ذاتہٖ الفاظ کا محتاج نہیں اسی طرح نفسِ شعر، وزن کا محتاج نہیں البتہ وزن کی شرط نظم کے لیے ہے۔ قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی مؤثر اور دلکش تقریر کرتا تھا اسی کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ اور دلآویز فقرے اور مثلیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش نے ''قرآن مجید'' کی نرالی اور عجیب عبارت سنی تو جنھوں نے اس کو کلام الٰہی نہ مانا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے لگے حالانکہ ''قرآن شریف'' میں وزن کا مطلق التزام نہ تھا۔ محقق طوسی ''اساس الاقتباس'' میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لیے وزنِ حقیقی ضروری نہ تھا۔ سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔ قافیہ بھی ہمارے ہاں شعر کے لیے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسے کہ وزن، مگر درحقیقت وہ بھی نظم ہی کے لیے ضروری ہے نہ شعر کے لیے۔ اساس میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے یہاں قافیہ بھی مثل وزن کے ضروری نہ تھا۔ الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے سوا اس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر کا شعر پر اطلاق کیا جاسکے۔ یہ دونوں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ اسی لیے زمانہ حال کے محقق شعر کا مقابل جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے نثر کو نہیں ٹھہراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حکمت کا کام براہ راست یہ ہے کہ ہدایت کرے، تحقیقات میں مدد پہنچائے اور روشن کرے عام اس سے کہ کوئی اس سے محظوظ یا متعجب یا متاثر ہو یا نہ ہو، اسی طرح شعر کا کام براہ راست یہ ہے کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کردے عام اس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اس سے حاصل ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ حالی نے یہاں انتہا درجے کی غلطی کی ہے اور اپنے معتقدوں کو غلطی میں ڈالنے کا کام کیا ہے۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ شعر کے لیے وزن شرط نہیں وہ اہل منطق ہیں اور ''اساس الاقتباس'' کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی فنِ منطق ہی میں ہے۔ منطقین کی اصطلاح میں شعر اور چیز ہے اور شعر کے نزدیک شعر اور چیز ہے۔ پس حالی نے نافہمی سے منطقیین کی تعریف کو شاعروں کی تعریف کی بحث میں داخل کردیا ہے۔ محقق طوسی نے ''اساس الاقتباس'' میں بطور منطقیوں کے شعر کی تعریف کی ہے کیونکہ یہ کتاب ہی منطق میں لکھی ہے۔ اور ''معیار الاشعار'' میں شعر کی تعریف اسی طرح کی ہے جو عرف جمہور میں مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ شعر کلام موزوں مقفّٰی کا نام ہے کیونکہ کتاب فنِ عروض میں لکھی ہے۔ پس منطقیوں کے نزدیک وزن شعر کی ماہیت میں معتبر نہیں۔ ان کے نزدیک جو کلام تضایائے مخیلیہ سے بنے وہ شعر ہے، وزن کا ہونا اس میں ضرور نہیں۔ چنانچہ شیخ بوعلی سینا ''کتاب شفا'' کی بحث منطق میں فرماتا ہے لانظر للمنطقی فی شی من ذلک الاقی کو نہ کلاماً مخیلاً یعنی منطقی کی نظر وزن اور قافیے کی طرف نہیں اس کے نزدیک تو یہ چاہیے کہ وہ کلام مخیل ہو اور دوسری جگہ کہتا ہے انما ینظر المنطقی فی الشعر من حیث ھو مخیل یعنی وہ شعر میں اس حیثیت سے فکر و غور کرتا ہے کہ وہ کلام مخیل ہے۔ اور امام رازی نے ''شرح عیون الحکمۃ'' میں فرمایا ہے ان نظر فیہ من حیثیت انہ یفید تخیلا قائما مقام التصدیق والترغیب فذلک ھوالمنطق۔ بلکہ محقق طوسی نے خود اساس میں دونوں اصطلاحوں کے فرقوں کو کھول دیا ہے اس طرح کہ شعر در عرف

''بحرالفصاحت'' جلد اوّل سے ماخوذ از حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری، صفحات۔600، قیمت : -/370

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاہم ان کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

منطقی کلامِ مخیل ست و در عرف متاخران کلامِ موزون مقفٰی اور دوسری جگہ لایا ہے مادۂ شعر سخن ست وصورتش نزد یک متاخران وزن وقافیہ ونزد یک منطقیاں تخیل اور پھر کھول کر اساس میں یوں کہا ہے نظرِ منطقی خاص ست بہ تخیل و وزن را از ان جہت اعتبار کنند کہ بہ وجہی اقتضای تخیل کند وصناعت منطق باحیثِ بالذات از تخیلِ شعر ست و بالعرض از دیگر احوال۔ یہ تو شعرِ منطقی کی نسبت تھا دیکھو شعرِ متعارف کی نسبت اساس میں کیا کہا ہے بہ حسب این عرف ہر سخن را کہ وزنی وقافیتی داشتہ باشد خواہ آن سخن برہانی باشد خواہ خطابی خواہ صادق خواہ کاذب و اگر ہمہ توحید خالص یا ہذیانات محض باشد آن را شعر خوانند و اگر ز وزن و قافیہ خالی باشد اگر چہ مخیل بود آن را شعر نخوانند۔ اور مخیلات وہ باتیں ہیں کہ جب نفس کو پہنچتی ہیں تو وہ ان کی تاثیر سے کسی چیز کی طرف راغب ہو جاتا ہے یا اس سے نفرت کرنے لگتا ہے بغیر خدر وفکر کے کیونکہ نفس رغبت یا دہشت سے منفعل ہو جاتا ہے اور تخیل کا اثر بہ مقابلے تصدیق کے نفس پر جلد پڑتا ہے، کیونکہ اس میں تعجب صدق سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ لذیذ ہے۔ اور مخیلات کئی طرح کے ہوتے ہیں کبھی سچے ہوتے ہیں کبھی جھوٹے ہوتے ہیں کبھی مستحیل ہوتے ہیں کبھی ممکن ہوتے ہیں اور نفس میں ان کے اثر سے یا انبساط پیدا ہو جاتا ہے یا انقباض۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخیلات کی تاثیر تصدیق سے زیادہ ہوتی ہے اگر چہ اس کے ساتھ تصدیق نہیں ہوتی، اور منطقین نے شعر کے لیے یہ بات شرط کی ہے کہ کلام قانون لغت کے مطابق ہو، اور اس میں ایسے اعلیٰ درجے کے استعارے اور عمدہ تشبیہیں ہوں کہ نفس میں ان کی وجہ سے تاثیر عجیب اور انفعال غریب پیدا ہو کر فرحت یا رنج وغم آ جائے۔ اسی لیے قضایا شعریہ میں اولیات صادقہ کا استعمال جائز نہیں، اور اولیات صادقہ سے مراد ایسے قضایا ہیں کہ عقل ان قضایا کا تصور کرتے ہی ان کے قطعی ہونے کا حکم لگا دیتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف محتاج نہیں ہوتی، جیسے کل بڑا ہے جز سے بلکہ شعر میں مخیلات کاذبہ کا استعمال مستحسن ہے۔ جس شعر میں مخیلات صادقہ کا استعمال ہوتا ہے وہ بے مزہ ہوتا ہے جیسے ناسخ کی نظم سراج کے یہ شعر:

کی خدا نے جو یہ زبان عطا
ہے بلا شک عطیۂ عظمیٰ
اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز
اس سے پاتے ہیں لذت ہر چیز
کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی
نمکین کوئی، کوئی کھٹ مٹھی
کوئی اچھی ہے کوئی زشت و زبوں
مزے سب چیزوں کے ہیں گوناگوں
سب مزوں سے زبان واقف ہے
ان ہی اسرار کی یہ کاشف ہے
جو نہ ہو یہ تو کچھ نہ ہو معلوم
نہ ہو کوئی مزہ کبھی ملہوم
اور بھی ہوتے ہیں زباں سے کام
ہے مدد وقت بلع آب و طعام
اس سے احکام بہرِ دنداں ہے
قوت نام بہرِ دنداں ہے

ولہ

نفع کیا کیا ہوا کو بخشا ہے
صحتِ جسم اس سے پیدا ہے
بعض اوقات اگر ہوا نہ چلے
کبھی دن رات اگر ہوا نہ چلے
دم رکیں، آدمی پڑیں بیمار
میوے فاسد ہوں سوکھیں پھل اک بار
آوے طاعون یا وبا آوے
غلے پر آفت وبلا آوے
اس سے ہے زندگانیٔ ابداں
اس سے ہے نفع صحتِ انساں
ناک سے جوفِ تن میں جاتی ہے
زندگی اس سبب سے آتی ہے
خارج تن میں لگتی ہے اگر
حق میں ابدان کے ہے مصلح تر

اسی طرح یہ شعر مولوی محمد حسین آزاد کے:

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
دامان کوہسار میں اب جاکے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو
اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لیے
اور رات کو بنایا ہے آرام کے لیے

لیکن یہ قاعدہ اکثری ہے نہ کلی اس لیے کہ بعض باوجود صدق مقدمات کے عمدہ استعاروں اور برجستہ تشبیہوں کی وجہ سے نفس میں تاثیر اور لذت پیدا کرنے میں مخیلات کاذبہ سے کم نہیں ہوتی، جیسے متاخرین میں سے درد تخلص

ایک شاعر سیر کوہسار کی کیفیت لکھتا ہے:

درحقیقت ہے عجب پُرلطف سیر کوہسار
جس کے ہر نظارے پر صد ذوقِ جنت ہے نثار
ایستادہ ہیں کروڑوں اک طرف ساکھو کے پیڑ
گررہے ہیں دوسری جانب ہزاروں آبشار
دیکھتا کیا ہوں کہ صدہا چشمہ ہائی کوثری
سنگلاخوں پر ہیں کرتے اپنی ہستی کو نثار
اک طرف سرآسماں جاہی ہیں صدہا چوٹیاں
دوسری جانب نظر آتے ہیں دہشت ناک غار
رستمِ دوراں بھی ان غاروں کو گر دیکھے کبھی
کیا عجب ہے خوف سے آجائے اس کو بھی بخار
باوجود اس کے ہے ان میں کچھ عجب دل بستگی
یعنی اٹھتی ہیں اسی جانب پہ نظریں بار بار
تحفۂ کوہی کی طرف دیکھو کہ کس انداز سے
باغباں قدرت کا دکھلاتا ہے پھولوں کی بہار
نرم نازک ڈالیوں پر ان سے بھی نازک ہیں برگ
اور ان پتوں کی نوکیں کس طرح ہیں قطرہ بار
کس قدر دل چسپ تھا نظارہ ہنگامِ سفر
اونچی اونچی چوٹیوں پر لہلہاتے مرغزار
ایک جانب اٹھ رہا ہے قلہ ہائے کوہ سے
کس قدر آہستہ آہستہ یہ نورانی غبار
رفتہ رفتہ چھا گیا اطرافِ وادی میں دھواں
اور پھر پڑنے لگی چاروں طرف ہلکی پھوار
اس کو میں ناحق دھواں کہتا ہوں یہ تو اصل میں
کوہِ مواج ہے یا جوئے شیریں کی ہے دھار
یا کہ امنائے زمانہ کی زبونی دیکھ کر
قلب سے اشجارِ صحرا کے یہ نکلا ہے بخار
یا کہ آہیں مجتمع فرقت کے ماروں کی ہیں یہ
جارہی ہیں بہرِ عرضِ حال سوئے کردگار
یا نظر بازوں کی نظروں سے بچانے کے لیے
حسن کو ہی پر یہ پردہ کھنچ رہا ہے بار بار
الغرض جو کچھ بھی ہو یہ ہے بہت دل چسپ چیز
دیکھنا اب رفتہ رفتہ ہورہا ہے کم غبار
جس قدر کم ہوتا جاتا ہے یہ نورانی دھواں
بس اسی نسبت سے ظاہر ہورہے ہیں سب اُبھار

جس طرح تصویر خانے میں مصوّر کی پلیٹ
اپنی جزئیات کا کرتی ہے تدریجی اُبھار
بس اسی صورت سے ہٹتا ابر ہے کم ہورہا
آرہے ہیں پھر مرے پیشِ نظر کوہی سنگار

بہر صورت جمہور کے نزدیک شعر میں وزن اور قافیہ دونوں معتبر ہیں۔ صرف تخیل ہی کافی نہیں۔ پس جوسخن وزنِ حقیقی اور قافیہ رکھتا ہو خواہ اس کی ترکیب برہانیات سے ہو یا جدلیات سے یا خطابیات سے یا مغالطات سے یا تخیلات سے وغیرہ وغیرہ وہ شعر ہے اور تخیل ذات شعر میں معتبر نہیں اسی لیے شعر کی تعریف کلام موزون مقفی کے ساتھ کرتے ہیں نہ کلام تخیل موزون مقفی کے ساتھ۔ اور وزن (واو کے فتح زائے ہوز کے سکون سے) مراد ہے اس ہیئت سے جو نظامِ ترتیب حرکات وسکنات اور ترتیب حروف اور تناسب عدد حروف اور مقدار کے تابع ہو، ایسے نہج پر کہ نفس اس سے ایک خاص قسم کی لذت کا ادراک کرے۔ اس ادراک کو ذوق کہتے ہیں۔ ''میزان الوانی'' میں محمد سلیم بن عظیم جعفری نے کہا ہے کہ بعض کے نزدیک وزن ہیئتِ ذوقی کا نام ہے جو ذہنِ مستقیم میں حاصل ہوتی ہے ترتیب ارکانِ موضوعہ ہے اور نتیجہ دونوں تعریفوں کا ایک ہے۔ تناسب عدد سے مراد یہ ہے کہ ارکان مصرعوں کے مساوی ہوں۔ پس چار رکن والا مصرع تین رکن والے مصرع کے ساتھ موزوں نہ سمجھا جائے گا۔ اور مقدار کے تناسب سے یہ مراد ہے کہ ارکان باہم مقدارِ حروف میں متناسب ومتقارب ہوں۔ پس جو مصرع تین مفعولن پر مشتمل ہو وہ اس مصرع کا جو تین مستفعلن پر مشتمل ہو متحد الوزن نہ ہوگا لیکن سالم اپنے مزاحف کے ساتھ جیسے فعولن اور فعولان۔ اسی طرح ایک مزاحف دوسرے مزاحف کے ساتھ مثلاً فعول اور فعل تناسب معتبر سے خالی نہیں اور چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے اوزانِ شعر بھی قوموں میں مختلف طور پر ہوتے ہیں اور ہر موزوں کی وجہ سے تخیل ہوتا ہے اور اک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے، مگر یہ ضرور نہیں کہ کلامِ تخیل وزن شعر رکھتا ہو بہت سی نثر کی عبارتیں تخیل کا فائدہ بخشتی ہیں اور چونکہ وزن سے کلام کی خوبی دوبالا ہوجاتی ہے اسی لیے کہا ہے کہ وزن دار کلام سلاست میں پانی کی طرح ہے اور لطافت میں ہوا کی مثل ہے اور انتظام میں موتیوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ عرب کی قدیم شاعری میں جو زیادہ تر برجستہ فقرے اور مثلیں پائی جاتی ہیں تو اس سے شاعروں کی طبیعت کی خوبی ثابت ہوتی ہے اور یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ شعر کے لیے وزن ضرور نہیں، اور عرب جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر پیغمبر خدا کو شاعر کہنے لگے تھے تو اس سے بھی یہ امر ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا کہ شعر کے لیے وزن شرط نہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ فصیح و بلیغ کلام نظم ہو یا نثر شاعر ہی ادا کرسکتا ہے۔ نظم اور شعر میں وزن اور عدم وزن کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، دونوں میں وزن معتبر ہے۔ شعر کی اصطلاح میں نظم الفاظ کی ایسی ترکیب کو کہتے ہیں کہ ان کے

معانی میں بھی ترتیب ہو اور ان کی دلالات کا بندوبست مقتضائے عقل کے موافق ہو اور یہ بات نہ ہو کہ لفظوں کو آگے پیچھے بول دیا جائے اور جس طرح اتفاق پڑے بغیر لحاظ ترتیب اور دلالت کے ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ملا دیا جائے۔ پس یہ نظم ہے:

یہ چوٹی زرافشاں مانگ سبز اس پر دو شالہ ہے
تماشا ہے پر طاؤس نے کالے کو پالا ہے

اور جب اس کو یوں کہیں:

یہ افشاں زر سبز مانگ دو شالہ چوٹی ہے اس پر
پر ہے تماشا کو کالے طاؤس پالا ہے

تو یہ لفظ ہوگا نہ نظم۔ اور حالی کا یہ کہنا کہ حال کے محقق شعر کا مقابل نثر کو نہیں ٹھہراتے بلکہ علم وحکمت کو ٹھہراتے ہیں، یہ بھی درست نہیں۔ اسلامی دنیا کے تمام انشا پرداز اور سخنور بالاتفاق شعر کا مقابل نثر کو ٹھہراتے ہیں۔ عروضیوں کا یہ مذہب ہے اور جو لوگ شعر کا مقابل علم وحکمت کو ٹھہراتے ہیں وہ اہل فلسفہ ہیں۔ ان کے نزدیک شعر غیر یقینیات میں سے ہے اس لیے وہ علم وحکمت یعنی یقینیات کا مقابل ہے۔ پس ہر اک علم کی علاحدہ اصطلاح ہے اور یہ کہنا کہ شعر کے لیے وزن حقیقی ضروری نہ تھا سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے بالکل تحقیق کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے شعر کے لیے وزن ضروری ہے۔ البتہ موجودہ قواعد وزن کو عورتوں نے ایجاد کیا ہے ورنہ فن عروض کی ایجاد کے پہلے سے بھی شعر وزن دار ہوتے تھے اور ان کے وزن کا معیار وجدان سلیم اور ذوق طبع مستقیم تھا۔ ان ہی اشعار کو جانچ کر وزن کے قواعد مقرر ہوئے ہیں۔ اور محقق طوسی نے اساس میں یہ جو کہا ہے کہ قدما کلام تخیل کو شعر کہتے تھے اگرچہ وہ وزن حقیقی نہ رکھے ہوتے اور یونانیوں کے بعض اشعار اس طرح کے تھے اور دوسری پرانی زبانوں جیسے عبری، سریانی، فارسی میں بھی اس کا اعتبار نہ تھا۔ عرب نے اوّل وزن حقیقی کو شعر میں اعتبار کیا ہے مثل قافیہ کے اور پھر دوسری قوموں نے ان کی متابعت کی۔ یہ قول بھی حالی صاحب کے مفید نہیں اس لیے کہ ہم یہ کہیں گے کہ قوموں نے جس شعر میں وزن کا اعتبار نہ کیا تھا وہ وہ ہے جو یقینیات کے مقابل ہے اور قدما سے مراد محقق طوسی کی حکما وفلاسفہ ہیں نہ کہ شعرا کیونکہ شعرا واہل عروض کو انھوں نے متاخرین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، علاوہ اس کے ان زبانوں میں علما نے علم عروض کے قواعد بھی منضبط نہ کیے تھے اس لیے سوائے ذوق طبع سلیم کے وزن شعر کے جانچنے کا کوئی معیار نہ تھا۔ یہی حال شعرائے عرب کا بھی تھا کہ وہ ذوق طبیعت سلیم کے اقتضا سے شعر تو کسی وزن عروضی پر کہتے تھے مگر ان کے ہاتھ میں اس کے جانچنے کے لیے کوئی میزان نہ تھی، اسی وجہ سے کبھی ایک وزن سے دوسرے وزن قریب پر انتقال کر جاتے تھے اور غلطیاں کھا جاتے تھے۔ قواعد عروض کو پیش نظر رکھ کر شعر کہے جاتے تھے جس کو جمہور کی اصطلاح میں شعر کہتے ہیں، ایسا شعر ہر زبان میں وزن دار ہی ہوتا رہا ہے۔ اگر کوئی جاہل اپنا دل خوش کرنے کو چند الفاظ بے وزن جوڑ کر ان کو شعر سمجھتا تو ایسا کلام اہل علم کے نزدیک سلف سے خلف تک کسی زبان میں شعر نہیں مانا جاتا اور یہ قول بھی صحت سے عاری ہے کہ عرب نے اوّل وزن حقیقی کو شعر میں اعتبار کیا اس لیے کہ ہندوؤں کے یہاں ہزاروں برس سے شعر میں وزن حقیقی کا اعتبار چلا آتا ہے۔ پس جس کلام میں وزن حقیقی موجود ہو وہ شعر ہے اور جس میں نہ ہو وہ نثر ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ قافیہ مطلق شعر کے واسطے ضرور ہے جیسے قصیدہ اور قطعہ اور رباعی وغیرہ اور اس تقریر پر ذاتیات شعر سے نہ ہوگا بلکہ اس کے عوارض سے ہوگا اور محققین کا گروہ اعظم قافیہ کا اعتبار ذات شعر میں واجب سمجھتا ہے۔ چنانچہ بوعلی سینا بھی شفا میں کہتا ہے لایکادان یسمی عندناالشعر مالیس بمقفی جو مقفی نہیں وہ ہمارے نزدیک شعر نہیں۔ یاد رکھو کہ کلام ان دو کلموں کو کہتے ہیں جو باہم ایسی اسناد رکھتے ہوں کہ اگر اس کا کہنے والا چپ رہے تو سامع کو فائدہ حاصل ہو جائے اور کچھ انتظار نہ رہے۔ پس شعر میں کلام کی قید سے سخن بے معنی بھی نکل گیا اور شعر کی تعریف اس پر صادق نہ آئی اس لیے کہ اس سے سامع کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا لیکن مجازاً اس کو بھی شعر کہتے ہیں جیسے کہیں یہ شعر مہمل و بے معنی ہیں مثال اس کی یہ شعر راشد علی ضیا بدایونی شاگرد منشی اسماعیل حسین منیر کا:

ملحوظ موقع طلب مدعا رہے
چشم حباب بحر میں سُرمہ لگا رہے

ایسے ہی یہ شعر شاگرد تخلص بدایونی کا:

تم چشم حنائی میں لگاؤ گے جو مسّی
ہر بیضۂ اشتر میں نکل آئیں گے چھالے

ہدہد الشعر

مرکزِ محورِ گردوں بہ لب آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہ مضراب نہیں

''آب حیات'' میں لکھا ہے کہ جب شیخ ناسخ کے پاس کوئی ناواقف شخص شائق کلام آتا تو چند بے معنی غزلیں بنا رکھی تھی ان میں سے کوئی شعر پڑھتے یا اسی وقت چند بے ربط الفاظ جوڑ کر موزوں کر لیتے اور سناتے اگر وہ سوچ میں پڑ جاتا اور چپ رہ جاتا تو سمجھتے تھے کہ کچھ سمجھتا ہے، اسے اور سناتے تھے اور اگر اس نے بے تحاشا تعریف کرنی شروع کر دی تو اسی طرح کے ایک دو شعر پڑھ کر چپکے رہتے تھے مثلاً:

آدمی مخمل میں دیکھے مور بچے بادام میں
ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
تو نے ناسخ وہ غزل آج لکھی ہے کہ ہوا
سب کو مشکل ید بیضا میں سخنداں ہوتا

□□□

مسعود حسین خاں

(ہماری مطبوعات سے)

قومی یک جہتی اور ہندوستانی زبانیں

قومیت اور قومی یک جہتی سیاسیات کے جدید تصورات اور اصطلاحیں ہیں۔ قومیت کا تصور تاریخ یورپ میں اٹھارھویں صدی عیسوی کی دین ہے۔ اس کا پہلا اظہار اس صدی کے وسط میں انگلستان میں ہوا اور اسی صدی کے آخر میں اس نے انقلاب فرانس کے لیے راہ ہموار کی۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے اسے سو سال کا عرصہ لگ گیا اور بالآخر بیسویں صدی میں اس نے ایشیا میں ایک ہمہ گیر تصور کی حیثیت اختیار کر لی۔

قومی یک جہتی یا ایکتا کی اصطلاح اور بھی زیادہ نئی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کوئی سیاسی اصطلاح ہی نہیں اور اگر ہے تو ایک منفی اصطلاح ہے اس لیے کہ قومیت کا تصور اپنے اندر یک جہتی کے وہ تمام مضمرات رکھتا ہے جس سے ایک اچھی اور متحدہ قومیت عبارت ہوتی ہے۔ وہ قومیت ہی کیا جو یک جہتی سے عاری ہو۔ دراصل آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کے گوناگوں مسائل میں ایک مسئلہ قومیت کا بھی تھا جس کے استحکام کے لیے قومی یک جہتی یا ایکتا کی اصطلاح تراشنی پڑی اور اس تصور کو عام کرنے کے لیے قومی یک جہتی کونسل کا قیام عمل میں آیا، کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اب ادارے قائم کیے جا رہے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ملک قومیت کے اعتبار سے اپنے آپ پر مکمل بھروسا نہیں کرتا تھا اور 'باہمہ' کے مقابلے میں 'بے ہمہ' کے عناصر سرگرم عمل تھے۔ چوں کہ ہندوستان، مذاہب، زبانوں، نسلوں اور ثقافتوں کے لحاظ سے ایک برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس میں انگلستان یا فرانس کی سی یک لسانی یا یک تہذیبی کی وحدت ڈھونڈنا عبث تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مشترک جغرافیائی حالات، مشترک تاریخ اور مشترک معیشت کے عناصر اس کے مختلف النسل باشندوں کو ایک وحدت میں جکڑے رہے ہیں لیکن ہندوستانی قومیت، قومیت کی اکثر شرائط سے عاری تھی۔ چنانچہ آزادی ملنے اور غلامی کی بخشی ہوئی وحدت کے تانے بانے ٹوٹنے کے بعد ہمارے اہل فکر نے اس بات کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ سیاسی و جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک ایسا دستور وضع کیا جائے جو وفاقیت کے بجائے مرکزیت کا حامل ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ علاقائیت فرقہ واریت اور لسانی علاحدگی پسندی کے میلانات تیزی سے ابھرنے لگے تھے جن کا مقابلہ کرنا ملک کی سالمیت کے لیے ضروری تھا۔ ہمارے دستور سازوں کی نیت برحق تھی لیکن یہ صرف تاریخ بتائے گی کہ یہ دستور کہاں تک ہمارے قومی تقاضوں کا ساتھ دے سکے گا۔

یورپ کی چھوٹی چھوٹی قوموں کے پیش نظر مفکرین سیاسیات نے قومیت کی ایک اہم شرط لسانی وحدت بھی بتائی ہے۔ ایسے کہتے وقت ان کے سامنے انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک کی قومیتیں تھیں لیکن جیسے جیسے قومیت کا مغربی تصور ایشیا میں عام ہوتا گیا اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملکوں میں آزمایا جانے لگا، اس کے مسائل سامنے آنے لگے۔ یوں تو ہندوستان چھوٹی بڑی کئی درجن زبانوں اور بولیوں کا مجموعہ ہے لیکن دستور ہند کی تشکیل کے وقت گرما گرم بحث کے بعد صرف چودہ بڑی زبانوں پر اتفاق رائے ہو سکا۔ بعد میں دستور کے آٹھویں شیڈول کی فہرست میں پندرھویں صدی سندھی کا اضافہ اور کر دیا گیا۔ انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے ان زبانوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔ (1) آسامی (2) بنگالی (3) گجراتی (4) ہندی (5) کنڑ (6) کشمیری (7) ملیالم (8) مراٹھی (9) اوڑیا (10) پنجابی (11) سنسکرت (12) سندھی (13) تمل (14) تلگو (15) اردو

''عام طور پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہے کہ جن زبانوں کی فہرست اس شیڈول میں دی ہوئی ہے وہ علاقائی زبانیں ہیں۔ یہ واقعہ نہیں۔ بلکہ اس فہرست میں صرف ان زبانوں کے نام دیے ہوئے ہیں جن کی نمائندگی اس کمیشن میں ہوگی جسے دفعہ 344 (1) کے بموجب راشٹر پتی مقرر کریں گے۔''

(ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح: ہارون خان شیروانی)

''مقالاتِ مسعود'' سے ماخوذ، از: مسعود حسین خاں، صفحات: 230، قیمت: -/18.50

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

زبانوں کی اس فہرست کا بالا ستعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبانوں کی اس ترتیب میں کوئی لسانی شعور کارفرما نہیں بلکہ یہ اہل سیاست کی ایک الجھے ہوئے معاملے کے سلسلے میں محض لیپاپوتی ہے۔ مثلاً پندرہ زندہ زبانوں میں ایک غیر مروجہ کلاسیکل زبان یعنی سنسکرت بھی شامل ہے۔ بارہ صاحب ریاست زبانوں کے ساتھ دو ایسی زبانیں بھی شامل کر دی گئیں جن کے بولنے والے کسی بھی علاقے میں اکثریت میں نہیں، یعنی اردو اور سندھی۔ ان میں سندھی کی حالت اردو سے بھی خستہ ہے۔ اسی لیے وہ پہلی فہرست میں شامل نہیں کی گئی تھی اور صرف سندھی بولنے والوں کے اصرار پر 1967 میں دستور میں اکیسویں ترمیم کے ذریعے داخل کی گئی ہے۔ بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے تاہم یہ کسی بھی ریاست میں دس فی صد سے زیادہ کی دعویدار نہیں ہوسکتی۔

ہندوستان کی مذکورہ بالا پندرہ زبانیں لسانی نقطۂ نظر سے تین خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں دو بڑے خاندان (1) ہند آریائی اور (2) دراوڑ ہیں۔ ان میں ہند آریائی سب سے بڑا خاندان ہے اس لیے کہ 15 میں سے دس زبانوں، آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، مراٹھی، اوڑیا، پنجابی، سنسکرت، سندھی اور اردو کا تعلق اس خاندان سے ہے۔ دراوڑ خاندان کی صرف چار زبانیں شامل فہرست ہیں۔ یعنی کنڑ، ملیالم، تمل اور تلگو۔ کشمیری کا تعلق تیسرے خاندان سے ہے۔

دستور میں دی ہوئی زبانوں کی اس فہرست سے اس مغالطۂ لسانی کا امکان ہے کہ ہم بہت سی ایسی بڑی بولیوں کو نظرانداز کر دیں جن کی اپنی تاریخی اور علاقائی انفرادیت ہے۔ ان میں ہندی کے علاقے میں بھوجپوری اور راجستھانی قابلِ ذکر ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی نے اسی وجہ سے 15 نہیں 21 زبانوں کو اپنی منظورشدہ فہرست میں انعامات اور نمائندگی کے لیے جگہ دی ہے۔

زبانوں کے اس ''مینارِ بابل'' کا مقابلہ ہمارے دستور سازوں نے دفعہ 343 کے ذریعے کیا ہے جس میں یونین کی سرکاری زبان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

1. ''یونین کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جسے دیوناگری لپی میں لکھا جائے گا۔''

''یونین کی سرکاری غرضوں کے لیے جو عدد استعمال کیے جائیں گے ان کی شکل وہی ہوگی جو ہندوستانی عددوں کی بین قومی شکل ہے۔

2. باوجود ضمن (1) کے کسی اندراج کے، اس دستور کے جاری ہونے کے پندرہ برس تک یونین کے تمام ایسے مقصدوں کے لیے جن کے واسطے انگریزی زبان اس دستور کے جاری ہونے سے ٹھیک پہلے استعمال ہوتی تھی، برابر اسی طرح استعمال ہوتی رہے گی.....''

دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں ہندی کو نہ صرف یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ یونین کی سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی ہے بلکہ دفعہ 345 کی رو سے ہندی کو اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، ہماچل پردیش اور دہلی کی ریاستوں نے بھی اپنی سرکاری زبان بنا دیا ہے۔

یہ ہے ہندوستان کا لسانی نقشہ۔

تین مختلف خاندانِ السنہ کی 15 منظورشدہ زبانیں، جن میں سے دو، اردو اور سندھی کے اپنے علاقے نہیں۔ ایک بین الاقوامی بدیسی اور ایک غیر مروج کتابی زبان۔ ان میں تال میل ہو تو کیسے ہو؟ 1956 میں ہندوستان کو لسانی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کی وجہ سے ریاستی زبانوں کی اہمیت بڑھ گئی اور ساتھ ہی کوئی ایسی ریاست باقی نہیں رہی جس میں اقلیتی زبانوں کے مسئلے پیدا نہ ہوگئے ہوں جن کے حل کے لیے دفعہ 350، 350 (الف) اور 350 (ب) وضع کی گئی جن میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی سہولتوں اور لسانی اقلیتوں کے لیے خاص عہدیدار مقرر کرنے کا تذکرہ ہے۔

غیر ہندی دانوں کی تالیفِ قلب کے لیے سرکاری زبان یعنی ہندی کے لیے دفعہ 351 میں ایک لائحۂ عمل بھی تیار کیا ہے جو لسانی مسائل پر اہل سیاست کی تخلیقِ فکر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ سنیے:

''یونین کا فرض ہوگا ہندی زبان کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی کرے اور اسے اس طرح ترقی دے کہ وہ ہندوستان کے ایک کلچر کے سارے عنصروں کے اظہار خیال کا ذریعہ بن جائے اور اس زبان کو اس طرح مالا مال کرے کہ وہ اپنی روح کو متاثر کیے بغیر اس میں ہندوستانی زبان اور ان زبانوں کی شکلیں، اسلوب اور اظہار کے طریقے جذب ہو جائیں جن کا آٹھویں شیڈول میں ذکر کیا گیا ہے نیز اس کی لغت کے لیے بنیادی طور پر سنسکرت زبان سے اور ثانوی طور پر دوسری زبان سے لفظ حاصل کیے جائیں۔''

(''ہندوستان کا دستور اور اس کی شرح''۔ ترجمہ۔ ہارون خاں شیروانی)

ہمارے دستور کا یہ لسانی ہدایت نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جس پر ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس میں صرف ایک مثبت تجویز ہے۔'' اس کی لغت کے لیے بنیادی طور پر سنسکرت زبان سے لفظ حاصل کیے جائیں۔'' جو ہندی اپنی اصطلاحات سازی کے لیے کر رہی ہے۔ زبانیں ہدایت ناموں سے نہیں بنا کرتیں ان کے ارتقا کی اپنی ڈگر ہوتی ہے۔

قومی یک جہتی کے خواہش مند لوگ اکثر اوقات لسانی یک جہتی اور لسانی وحدت میں امتیاز نہیں کرتے۔ لسانی وحدت اس ملک کا مقدر نہیں، ہر چند آزادی کی پہلی گری میں بعض ناعاقبت اندیشوں نے انھی خطوط پر سوچنا شروع کردیا تھا۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ زبان کے معاملے میں جماعتیں بعض اوقات مذہب سے بھی زیادہ جذباتی ہوجاتی ہیں۔ بنگلہ دیش کا عبرت ناک انجام ہمارے سامنے ہے جہاں مشترک مذہب بھی پاکستانی قومیت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہیں بچا سکا۔ پنجاب کی موجودہ سیاست میں بھی کافی حد تک لسانی جذبے کی کارفرمائی ہے۔ اردو والوں کی تلخی کام و دہن بھی کچھ اسی سبب سے رہتی ہے۔ کنڑ اور مراٹھی کی سرحدی زور آزمائی کا بھی یہی باعث ہے۔ تلگو دیشم کی تحریک میں بھی ''تلگو'' جزو اصلی ہے۔

غرض کہ لسانی سطح پر ہر طرف ایک انتشار کا سا عالم دکھائی دیتا ہے۔ یک جہتی اور ایکتا کا کوئی نعرہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔ اس لیے حب وطن اور عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی قومیت کے دیگر مسائل کی طرح ہندوستان کے لسانی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ لسانی ایکتا کا رولر پھیرنے کی کوشش نہیں کریں بلکہ ہر زبان کے بولنے والوں کے تقاضوں اور مانگوں پر انصاف کے نقطۂ نظر سے ہمدردانہ طور پر غور کریں۔ زبان کو شخصیت متحرک کہا گیا ہے۔ تہذیب کے ایک خارجی مظہر ہونے کے باوجود بعض اوقات اس کی اہمیت کسی تہذیب کے تمام عقائد سے فزوں تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسی میں اہل زبان خود کی بازیافت کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ بے نام کو نام دیتا ہے۔ خود عقائد کی پرورش اسی کی گود میں ہوتی ہے۔ غرض کہ پوری تہذیب کا محور اور مظہر زبان ہوتی ہے۔ آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہندومت اور اسلام بغیر سنسکرت اور عربی کے کیا ہوتے؟ گیتا کے الفاظ کی گونج ذہن کے کس کس گوشے تک پہنچتی ہے، قرآن کا اعجاز خون کی گردش کو کس طرح تپش آمادہ تر کر دیتا ہے، یہ سوال نہیں حقیقت ہے۔ ہمارے عظیم شعرا کس طرح زندگی کے ہر ہر موڑ پر اپنے مرصّع الفاظ اور تراکیب سے ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور کس طرح وہ ہمارے شعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ ادب نواز ہی نہیں بندہ نواز بھی جانتے ہیں، شعور بغیر زبان کے محض ایک تصور ہے۔

کثیر لسانی ممالک کے لسانی حل کے کئی نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ چھوٹے پیانے پر سوئزرلینڈ اور ہالینڈ کی قومیتیں ہیں جہاں ایک سے زائد زبانیں رائج ہیں اور ان سب کو برابر طور پر سرکاری زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ سوئزرلینڈ میں تو جرمن اور فرانسیسی جیسی دو ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ اطالوی خاندان کی ایک بولی کو بھی جس کے بولنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم ہے، سرکاری طور سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایک نمونہ ہمارے سامنے کناڈا کا ہے۔ جہاں کی ہمہ گیر زبان انگریزی ہے لیکن چند ذیلی علاقوں میں فرانسیسی کو بھی مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں بھی یورپ کی کئی زبانیں بولنے والے آباد ہوئے۔ خاص طور پر اس کی جنوبی ریاستوں ٹیکساس، اری زونا، جنوبی کیلیفورنیا وغیرہ میں ہسپانوی زبان بولنے والے بڑی تعداد میں بس گئے تھے اور ان علاقوں میں عرصہ تک ہسپانوی زبان کا چلن بڑے پیانے پر رہا لیکن رفتہ رفتہ تاریخ کی گردشوں میں انگریزی ہسپانوی پر غالب آتی گئی۔ اس طرح کہ اب ریاست ہائے متحدہ کی انگریزی واحد زبان کہی جاسکتی ہے۔ ہر چند وہاں ہسپانوی اور فرانسیسی پڑھنے والے اور اس زبان اور تہذیب پر فخر کرنے والے آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

لسانی حل کا ہمارے سامنے ایک اور بڑا نمونہ اشتراکی روس کا ہے جہاں کئی خاندانوں کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً ازبیک کا تعلق ترکی خاندان السنہ سے ہے اور تاجیک کا ایرانی خاندان سے ہے۔ زار روس کے زمانے میں بھی اور اشتراکی روس کی حکومت میں بھی اقتدار روسی زبان کا رہا ہے۔ روسی ترکستان کی بولیوں کے لیے پہلے رومن رسم خط کو آزمایا گیا۔ پھر مصلحتاً روسی خط میں ان کو لکھا جانے لگا۔ ہر صورت میں قدیم فارسی و عربی رسم خط سے اجتناب کیا گیا۔ آج روس کی لسانی وحدت کی نیو روسی زبان ہے جو شروع سے اس قدر ترقی یافتہ رہی ہے کہ یورپی روس ہو کہ روسی ترکستان کی زبانیں، ان سب پر چھائی رہی ہے۔ لسانی مسئلے کے حل کرنے میں روس کے آہنی نظام حکومت سے بھی مدد ملی۔ چاہے وہ زار روس کا عہد ہو یا ''طریق کوہکن'' انداز وہی پرویزی رہے۔ یہ صورت ہندوستان جیسی جمہوریت میں ناممکن ہے جہاں عوام ذرا سی ناراضگی میں حکمرانوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لسانی فاشسٹ بھی جو آزادی کے ابتدائی نشے میں یہ سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کی کثیر لسانی پر روس کا سا یک لسانی رولر پھیر سکیں گے۔ رفتہ رفتہ اس کے قائل ہوتے گئے کہ یہاں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہندی ایک ووٹ سے سرکاری زبان تو بنادی گئی لیکن صرف اس کو قومی زبان (راشٹر بھاشا) تسلیم کیا جائے یہ کسی طرح سے غیر ہندی بولنے والوں کے گلے سے نیچے نہیں اتر سکا اس لیے کہ راشٹر بھاشائیں، تو ہندوستان کی سبھی زبانیں ہیں...... دوسرے الفاظ میں روس کا لسانی ماڈل یہاں رائج نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نہ تو یہاں ہندی کی وہ حیثیت ہے جو روسی کی چلی آئی ہے اور نہ یہاں کا سیاسی نظام اجازت دیتا ہے کہ عوام کے ہونٹوں پر تالے لگادیے جائیں۔ اتفاق سے آزادی حاصل ہونے کے وقت ہندی، ہندوستان کی کئی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ بھی نہیں۔ ہندی کی آنا فانا ترقی

تو آزادی ملنے کے بعد ہوئی ہے۔ مثلاً آزادی سے قبل اردو واحد زبان تھی جس میں یونیورسٹی کی سطح تک اعلیٰ تعلیم دی جارہی تھی اور مراٹھی تجارتی زبان تھی جس میں ایک بڑے پیمانے پر انسائیکلوپیڈیا شائع ہوچکی تھی۔ بنگالی اور تمل بھی کئی لحاظ سے ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ زبانیں تھیں۔

لہٰذا علی جلی معیشت کی طرح قومی سطح پر لسانی مسائل کے حل کے لیے ہمیں اپنا مخصوص ماڈل بنانا پڑے گا۔ میرے نقطۂ نظر سے اس ماڈل کے بنیادی مسائل حسب ذیل ہوں گے۔

1. لسانی انصاف پسندی جس کی رو سے ہندوستان کی تمام زبانیں، قومی تسلیم، کی جائیں گی۔ زبانیں بڑی ہوسکتی ہیں یا چھوٹی، ترقی یافتہ ہوسکتی ہیں یا ترقی پذیر لیکن کسی کو کسی پر یہ کہہ کر فوقیت نہیں دی جاسکتی کہ یہ زیادہ قومی ہے اور دوسری کم تر۔ اگر ہندی قدیم ہندوستان کی بہترین ترجمان کہی جاسکتی ہے تو اردو وسطی دور کے ہندوستان کی سچی نمائندہ کہی جائے گی۔ جمل قبل آریائی ہندوستان کی صدائے بازگشت رکھے گی۔ ہمارا تاریخی مقدر رنگارنگی ہے۔ بقول غالب:

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

2. لیکن لسانی انصاف پسندی کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خود کو ایک قسم کی لسانی طوائف الملوکی میں گرفتار کرلیں۔ اگر بڑی زبان بولنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ چھوٹی زبانوں کو پنپنے کا بھرپور موقع دیں اور ان کو اپنا حریف نہ سمجھیں تو چھوٹی زبانیں بولنے والوں کی جانب سے یہ انصاف پسندی ہوگی کہ وہ بڑے کے بڑپن کو تسلیم کریں اور اس کو اس کا مقام دیں۔ چنانچہ دستور ہند میں ہمارے دستور سازوں نے ہندی کے لیے یہی کیا ہے جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے۔ ہندی سات ریاستوں کی سرکاری زبان ہے اور 1971 کی مردم شماری کے مطابق اس کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد 15 کروڑ چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ ظاہر ہے دوسری کسی زبان کے بولنے والے ساڑھے چار کروڑ سے زیادہ نہیں مثلاً تلگو بنگالی اور مراٹھی جو علی الترتیب ہندوستان کی دوسری تیسری اور چوتھی زبانیں ہیں۔ اس لحاظ سے ہندی کو فوقیت حاصل ہے اور رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اس کا سرکاری زبان کے منصب پر فائز کیا جانا۔ انصاف کے عین مطابق ہے۔ شروع شروع میں بعض ترقی یافتہ زبانوں مثلاً بنگالی اور تمل والوں نے منہ چڑایا تھا لیکن ان کے سامنے چارۂ کار نہیں اس لیے کہ یہ دونوں زبانیں بولنے والوں کو بجا طور پر یہ بھی سہولت دی گئی کہ دستور کے نفاذ کے 15 سال بعد تک انگریزی سرکاری زبان کے طور پر ہندی کے ساتھ رائج رہے گی۔ اس مدت میں پنڈت نہرو نے بعد کو یہ توسیع کی کہ انگریزی ساتھی زبان کی حیثیت سے رائج رہے گی۔ جب تک غیر ہندی والے خود اس بات کی خواہش نہ کریں کہ اسے ہٹا دیا جائے۔ میرے خیال میں لسانی سمجھوتے کے سلسلے میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔

3. ہندوستان کے لسانی ماڈل کی دوسری بڑی شرط یہ ہوگی (اور یہ انصاف پسندی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے) کہ بدیسی زبان اس ملک میں سرکاری یا تعلیمی کاروبار کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں تھوپی جاسکتی۔ دوسرے الفاظ میں انگریزی کی وہ حیثیت قائم نہیں رکھی جاسکتی جو اب تک رہی ہے۔ اس کا مقام رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ہندی کو اور ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ریاستی زبانوں کو ملنا چاہیے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کی سرکاری اور تعلیمی زبان کوئی بدیسی ہو، چاہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ اس ملک میں انگریزی کے لیے ایک مقام رہے گا۔ ایک عالمی زبان کی حیثیت سے اور مغربی علوم تک رسائی کے لیے یہ زبان ہمارے تعلیمی اداروں میں یقیناً جگہ پائے گی لیکن نہ اس طرح جس طرح کہ اب تک رہی اور جس طرح آج بھی ہمارے 'قوم پرست' اس کو رکھنا چاہتے ہیں۔ آزادی کے بعد سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کی جو رفتار ترقی ہونا چاہیے تھی، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہیں رہی ہے۔ دستور کی دفعہ 344 کے باوجود جس میں واضح الفاظ میں ہدایت ہے کہ:

1. راشٹرپتی کے لیے ضروری ہوگا کہ دستور کے جاری ہونے سے پانچ برس گزرنے پر اور اس کے بعد اس کے جاری ہونے سے دس برس گزرنے پر اپنے حکم کے ذریعے ایک کمیشن مقرر کریں۔

2. اس کمیشن کا فرض ہوگا کہ راشٹرپتی کو حسب ذیل معاملات کے بارے میں سفارش کرے۔

(ا) یونین کے سرکاری مقصدوں کے لیے ہندی زبان کا بڑھتا ہوا استعمال۔

(ب) کسی سرکاری مقصد یا سب سرکاری مقصدوں کے لیے انگریزی زبان کے استعمال کی حد بندی۔

افسوس کا مقام ہے کہ جنوبی ہند کی ریاستوں اور بنگال کی بالخصوص مخالفت کی وجہ سے کمیشنوں کے تقرر کے باوجود یہ حد بندی نہ ہوسکی اور انگریزی آج بھی اسکولوں، کالجوں اور سرکاری دفتروں میں ٹھسے سے جاری ہے۔

ہماری لسانی یک جہتی میں انگریزی کا رڑا اب تک موجود ہے۔ یہ کسی تنگ قوم پرستی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنی لسانیاتی معلومات کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ جو ریاستیں انگریزی کی حمایت کررہی ہیں وہ ہندوستان کی قومی یک جہتی

کی جڑیں کاٹ رہی ہیں۔ نوآبادیاتی ممالک کے علاوہ دنیا کی کوئی آزاد قوم کسی بدیسی زبان کو وہ مقام نہیں دیتی جو ہندوستان نے انگریزی کو دے رکھا ہے۔ انگریزی کی بدولت ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو معاشی، ثقافتی اور سرکاری تمام وسائل اور سہولتوں کا مالک بن گیا ہے۔ انگریزی نے ہمارے نونہالوں کے ذہنوں کو ابتدائی مدارج سے مفلوج بنا رکھا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اپنے نظام تعلیم میں کسی غیر زبان کو ابتدائی مدارج میں ذریعۂ تعلیم نہیں بناتا جو ہم نے بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم توتے کی رٹائی کے مانند ہوتی ہے اور خیال کا کوئی شگوفہ ان ذہنوں میں نہیں کھلتا۔ انگریزی کی جگہ اگر یہی مقام ہندی کو دے دیا گیا تو یہی بات غیر ہندی زبانوں کے مقابلے میں اس کے بارے میں کہی جاسکے گی۔ ذریعۂ تعلیم ہونے کا حق صرف مادری زبان کا ہوتا ہے۔ اختیاری مضمون کی حیثیت سے آپ چاہے دنیا کی کوئی زبان پڑھائیں اس میں مضائقہ نہیں۔

3. ہندوستان کی زبانوں کے تال میل میں سنسکرت زبان کا ایک خاص اور اہم مقام ہے جسے بروئے کار لانے کی مزید ضرورت ہے۔ سنسکرت کی نہ صرف شمالی ہندوستان کی تمام زبانوں پر (سوائے اردو اور کشمیری) کے چھاپ ہے بلکہ جنوب میں یہ تمل کو چھوڑ کر تلگو، کنڑ، ملیالم کے ارتقا میں بھی کم وبیش اسی طرح سے اثر انداز ہوئی ہے۔ خصوصاً اس کی اصلی لفظیات اور اصطلاحات علمیہ میں علمی اصطلاحات سازی میں سنسکرت کا یہ رول جاری رہنا چاہیے۔ البتہ تمل اردو اور کشمیری کی مانند جو زبانیں ''سنسکرتیت'' کے عمل کو اپنے تاریخی ارتقا کی مجبوریوں کی وجہ سے قبول نہیں کرتیں، انھیں چھوٹ ملنا چاہیے اور ان پر سنسکرت بنیاد اصطلاحات علمیہ کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ آزادی کے فوراً بعد ہندی کے بعض وددانوں نے کوشش کی تھی۔ خاص طور پر دستور ہند کے ترجمے کے سلسلے میں جس کے لیے بنی بنائی اصطلاحیں دے دی گئی تھیں جو دوسری زبانوں نے کم وبیش اپنا لیں لیکن اردو اور تمل والوں نے اپنی معذوری ظاہر کرکے بالآخر اپنی وضع کردہ اصطلاحوں میں اس کا ترجمہ کیا جس کے اقتباسات میں اس خطبے میں جابجا دیتا آیا ہوں۔ اس ضمن میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہمیں لاطینی بنیاد بین الاقوامی اصطلاحات علمیہ سے یک لخت منہ نہیں موڑ لینا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ دو تاغذوں سے ماخوذ علمی اصطلاحات سے زبان میں ایک کھچڑی کی سی کیفیت ضرور پیدا ہوجائے گی لیکن لسانی ارتقا کی دوڑ میں جو زبانیں بعد کو داخل ہوتی ہیں انھیں اس قسم کے لسانی سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں۔ مجموعی طور پر اصطلاحات علمیہ کے لیے ہمارا قبلہ سنسکرت زبان ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

4. قومی یک جہتی کے سلسلے میں لسانی اکثریت کا رویہ لسانی اقلیت کی جانب ہمدردانہ ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اردو کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ گو لسانی اقلیتوں کو دشواریاں مہاراشٹر، کرناٹک، آسام اور آندھرا ہر جگہ کم و بیش موجود ہیں۔ ملک کی بدنصیب تقسیم نے اردو کے مسئلے کو ایک مخصوص سیاسی اور فرقہ وارانہ رنگ دے دیا ہے اس لیے قومی یک جہتی کے سلسلے میں اس کا ذکر ''اردو بنیاد'' شہر میں ذرا تفصیل سے کرنا چاہوں گا۔

لسانی نقطۂ نظر سے اردو ایک ہند آریائی زبان ہے جو دہلی اور نواح دہلی (حضرت امیر خسرو کے مطابق ''زبانِ دہلی و پیرامونِ او'') کی بولی پر مبنی ہے۔ خود شہر دہلی کئی بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا کے اس پار کھڑی بولی کا علاقہ ہے اور اس پار ہریانوی کا۔ چالیس میل کی دوری سے جنوب میں برج بھاشا کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ صوتیات قواعد اور بیشتر فی صد لفظیات کا مآخذ وہی ہے جو موجودہ ہندی کا ہے۔ البتہ چند آوازیں۔۔۔ خ، غ، ز، ف اور ق۔۔۔ اور تیس فی صد الفاظ و اصطلاحات علمیہ اس کی عربی فارسی سے لی گئی ہیں۔ ان میں بھی بہت کم الفاظ ایسے ہیں جو براہ راست عربی سے لیے گئے ہوں، یہ سب کے سب فارسی کے وسیلے سے اردو تک پہنچتے ہیں کیا باعتبار تلفظ کیا باعتبار معنی، اس لیے کہ اردو ہندوستان کی تاریخ کے درمیانی دور میں ادبی و درباری زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔ اردو کو انگریزی نے پہلی بار 1835 میں فارسی کو ہٹا کر سرکاری و عدالتی زبان بنایا تھا۔ اس کی ایک اور اہم شناخت اس کا رسم الخط ہے جو عربی و فارسی رسم الخط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ توسیع شدہ شکل اس لیے کہ اردو کی مکھوسی آوازیں (ٹ، ڈ، ر) اور نفسی آوازوں کا سلسلہ (پھ، بھ، تھ، ٹھ، دھ وغیرہ) نہ تو فارسی میں پائے جاتے ہیں اور نہ عربی میں، یہ اردو والوں کی ایجاد ہیں۔ ان کے لیے کبھی دو لکیریں اور کبھی چار نقطوں سے کام لیا گیا، جس نے بالآخر الٹے (ط) کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح نفسی آوازوں کے لیے دو چشمی (ھ) کا استعمال کیا گیا لیکن اس کے استعمال میں وہ ضابطگی نہ آسکی جو مکھوس آوازوں کے طوعے میں ملتی ہے۔ اردو اپنی شعر و شاعری کی روایات، عروض اور اصطلاحات علمیہ کے لیے بھی فارسی، عربی کی گراں بار ہے۔ اس کا ادبی اسلوب دکنیات سے لے کر پریم چند اور اقبالیات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں ایک ریختہ و آمیختہ زبان ہے اور اسی لیے ایک مخصوص حسن اور توانائی کی حامل جو صرف ریختہ زبانوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ہمارے دستور کی رو سے آٹھویں شیڈول کی 15 زبانوں میں سے ایک

ہے، بولنے والوں کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے۔ یعنی گجراتی، ملیالم، کنڑ، اڑیا، پنجابی، آسامی اور کشمیری سے بڑی۔ 1971 کی مردم شماری کی رو سے اس کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد 28600428 تھی۔ کم از کم ہندوستان کے تیرہ اضلاع ایسے ہیں جہاں اس کے بولنے والوں کی تعداد 45 تا 26 فی صد ہے۔ ان میں اتر پردیش کے رام پور، مراد آباد، بجنور، سہارن پور بھی شامل ہیں، جہاں علی الترتیب اردو بولنے والوں کی 45-33-29 فیصد پائی جاتی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس کے بولنے والوں کی تعداد کسی ریاست میں 12 فیصد سے زائد نہیں۔ یہ اتر پردیش میں ایک کروڑ، بہار میں 50 لاکھ، مہاراشٹر میں 37 لاکھ، آندھرا پردیش میں 33 لاکھ اور کرناٹک میں 26 لاکھ سے زائد کی تعداد میں موجود ہیں۔ جموں و کشمیر میں جہاں کی یہ سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی ہے، مادری زبان کی حیثیت سے اس کے نام لیوا چند ہزار سے زائد نہیں۔ اردو کا مسئلہ ایک لسانی معمہ ہے جس کا حل قومی سطح پر ڈھونڈنا ہوگا۔ آزادی کے بعد اس کا نظام تعلیم درہم برہم کردیا گیا جس کے نتیجے میں آج جو لوگ چالیس سے اوپر ہیں انھی کے دل میں اس کا درد باقی رہ گیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، اس کو محبوبہ و معشوقہ بنانے والے آج بھی بہت لوگ ہیں لیکن اس کو بیوی کا درجہ دینے والے بہت کم ہیں۔ یعنی بہت کم لوگ اپنے بچوں کو اس کے ذریعے سے تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ اسی نسبت سے نئی نسل اپنی لسانی انفرادیت اور تشخص سے دور ہوتی جارہی ہے۔ مذہب، لسانی انفرادیت کا بدل نہیں بن سکتا۔ ہر زبان ایک مخصوص تاریخ، ایک مخصوص فکر اور ثقافت کی امین ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی تہذیب کے ''جلوۂ صد رنگ'' کو برقرار رکھنا ہے تو ہر زبان کو اپنی مخصوص ڈگر پر چلنے دینے کی اجازت دینا ہوگی۔ یہ تجاویز کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے یا اس میں ہندی کی اصطلاحات علمیہ کو جوں کا توں شامل کرلیا جائے نہ اردو کے ساتھ انصاف ہوگا اور نہ ہندی کے ساتھ۔ زبانوں میں تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے نمودار ہوتی ہیں۔ ان کے ارتقا کے اپنے اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ جبر سے بدلی جاسکتی ہیں اور نہ کسی سیاسی انقلاب کے دباؤ سے، جیسا کہ انقلاب روس کے بعد وہاں ماہرین لسانیات نے روسی کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی اور غلط ثابت ہونے پر اسٹالن کے عتاب سے بال بال بچ گئے۔ پنجاب کے المیے میں ان لوگوں کے لیے ایک لسانی سبق بھی ہے جو لسانی فاشسزم کو روا رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں پنجاب کا اصل مسئلہ بنگلہ دیش کی طرح لسانی مسئلہ ہے اور اس کے ذمے دار خود پنجاب کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے 1951 کی مردم شماری میں اپنی مادری زبان پنجابی کے بجائے ہندی لکھائی تھی۔

لسانی اکثریت کو، اردو ہو کہ پنجابی، خائف ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خائف تو کمزور کو ہونا چاہیے اور اردو سے خائف ہونے کی کوئی وجہ جواز ہی نہیں ملتی اس لیے کہ اردو قومی اور بین قومی سطحوں پر ہندی کی حلیف ہے نہ کہ حریف۔ دونوں ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں۔ قومی سطح پر اس کے ذریعے جنوبی ہند کی ریاستوں میں ہندی کے چلن کو مہمیز ملتی ہے اس لیے ان ریاستوں میں اردو مادری زبان لکھوانے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں جب کہ ہندی مادری زبان دانوں کی تعداد ہزاروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ ظاہر ہے تمل ناڈو ہو یا کرناٹک یا آندھرا پردیش ہندی کا ایک ہر اوّل دستہ اردو بولنے والوں کی شکل میں وہاں صدیوں سے موجود ہے۔ بین قومی سطح پر اردو کے رول کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے لیکن علم السنہ سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ عالمی سطح پر اس وقت چار پانچ زبانیں منطقی زبانوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آرہی ہیں یعنی انگریزی، روسی، چینی، ہسپانوی اور عربی۔ چھٹی زبان جسے جنوبی ایشیا میں علاقائی زبان کی حیثیت سے وسیلۂ ابلاغ بننے کے امکانات ہیں یہی ہندی اردو کا مجموعہ ہے جس کو عرصے تک ہم ہندستانی کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ عربی، فارسی رسم الخط میں اس کی تگ و تاز پاکستان، افغانستان، ایران خلیجی، ریاستوں عدن اور پورٹ سعید تک ہے۔ ہندی کی شکل میں یہ مشرقی ہندوستان سے گزرتی ہوئی برما، ملیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا تک پہنچتی ہے، جہاں کی بندرگاہوں میں یہ بول چال اور کاروباری زبان کی حیثیت سے گھر کرتی جارہی ہے۔ اس طرح اس لسانی، دوموہنی، کا ایک منطقہ بنتا جارہا ہے جہاں اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کروڑوں سے تجاوز کرچکی ہے اور اس کا ایک عالمی ادب اور اس کے ساتھ منصب بنتا جارہا ہے۔

ہماری قومی یک جہتی کے لیے لسانی وحدت شرط اولین ہے لیکن یہاں وحدت کا تصور اپنے اندر ''کثرت'' کے پہلو رکھتا ہے۔ جس طرح ہندی کو ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے ترقی دینا از بس ضروری ہے اسی طرح چھوٹی اور اقلیتی زبانوں کو پھلنے پھولنے کا مکمل موقع دینا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کثرت میں وحدت ہمارا مقدر ہے، ہر زبان کی پاسداری ہمارا ایمان ہے، ہندی کی اولیت ہماری قومی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کیفیت ربط و اختلاط ممکن ہے جس کی جانب شاعر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

باہزاراں چشم باید یک نگاہ

□□□

اردو خبر نامہ

اردو ٹیچروں کی تقرری اور مدارس کی جدید کاری

● نئی دہلی۔ 13 جولائی، وزارت فروغ انسانی وسائل نے آج یہ اطلاع دی کہ اردو ٹیچروں کی خدمات حاصل کرنے اور مدرسوں کی جدید کاری کے لیے فراہم کیا گیا مرکزی فنڈ متعدد ریاستوں نے استعمال نہیں کیا۔ وزارت کے ایک بیان میں کہا گیا کہ اردو بولنے والوں کی خاطر خواہ آبادی والی 16 ریاستوں کی حکومتوں کے نمائندوں کے ساتھ سکریٹری سطح کی جائزہ میٹنگ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا۔ اس میٹنگ میں دو مرکزی اسکیموں اردو ٹیچروں کی تقرری اور مدرسوں کی جدید کاری پر دسویں پنج سالہ منصوبے کے دوران فراہم کیے گئے فنڈ کے استعمال کا جائزہ لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے تمام ریاستوں کو ہدایت دی کہ اردو بولنے والوں کی آبادی کا مناسب جائزہ لینے کے بعد اس کی بنیاد پر 2007-08 میں اردو ٹیچروں کی تقرری اور مدرسوں کی جدید کاری کے بارے میں اپنی تجویزیں وزارت فروغ انسانی وسائل کو بھیجیں۔ یہ ہدایت اردو بولنے والوں کی خاطر خواہ آبادی والی 16 ریاستوں کے نمائندوں کے ساتھ وزارت فروغ انسانی وسائل کے سکریٹریوں کی ایک میٹنگ کے دوران جاری کی گئی۔ اس میٹنگ میں مرکزی حکومت کی دو اسکیموں کا جائزہ لیا گیا جس میں ایک کا تعلق اردو ٹیچروں کی تقرری سے ہے اور دوسری کا مدرسوں کی جدید کاری سے۔ اقلیتوں کی فلاح کے لیے وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام میں نکتہ 3 اور نکتہ 4 کا تعلق وزارت فروغ انسانی وسائل سے ہے۔ نکتہ 4 مرکزی منصوبے کے تحت علاقوں کو دھیان میں رکھ کر بنائی گئی اسکیم ہے، جو مدرسوں کے تحت علاقوں کو دھیان میں رکھ کر بنائی گئی ہے، اور مدرسوں کی جدید کاری کے پروگرام کو اصل مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ اس نکتے کے تحت تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں کی گھنی آبادی کے علاقوں میں تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنا اور مدرسہ تعلیم میں جدید کاری کے وسائل مہیا کرنا مقصود ہے۔ دسویں پنج سالہ منصوبے کے تحت فراہم کیے گئے فنڈ کا جائزہ لیتے وقت یہ بات سامنے آئی کہ اردو ٹیچروں کی تقرری کے لیے آندھرا پردیش، چھتیس گڑھ، اڑیسہ، مہاراشٹر، آسام، دہلی، پنجاب، ہریانہ، تمل ناڈو، اتراکھنڈ، گجرات اور مغربی بنگال سمیت متعدد ریاستی حکومتوں کے لیے جاری کیے گئے فنڈ کا خاطر خواہ استعمال نہیں کیا گیا اور جو رقم ابھی رہ گئی ہے وہ بھی ان ریاستوں کے پاس ہی ہے۔ یہی حال مدرسہ ایجوکیشن پروگرام کے تحت جاری کیے گئے فنڈ کا بھی ہے۔ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اردو آبادی کا اور ان علاقوں میں اردو میڈیم اسکولوں کا جائزہ لیں اور اس سلسلے میں ٹھوس تجویزیں بھیجیں تاکہ موجودہ اسکیم کے تحت مرکزی حکومت ان کو گرانٹ دے سکے۔ میٹنگ میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ٹیچروں کے لیے سالانہ زیادہ سے زیادہ 50,000 روپے کی امداد فراہم کرنے کی بالائی حد ختم کی جائے گی تاکہ ان ٹیچروں کی پوری تنخواہ اس اسکیم کے تحت دی جائے اور کسی بھی علاقے کو امداد دی جاسکے، وہ چاہے بلاک سے بھی چھوٹا کیوں نہ ہو، بشرطیکہ وہاں 25 فیصد یا اس سے زائد کی آبادی اردو بولنے والوں کی ہو۔ انھوں نے کہا کہ لڑکیوں کے مزید مدرسوں کو مدرسہ جدید کاری اسکیم کے تحت لایا جائے گا اور اس کی طرف ریاستی حکومتوں کو اور زیادہ توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ ریاستوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ 11 ویں پنج سالہ منصوبے کے دوران مدرسوں کی جدید کاری کی اسکیم اور مجوزہ نظر ثانی پر اپنی رائے بھیجیں۔ مدرسہ جدید کاری کے لیے رواں مالی سال کے دوران 55 کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

(ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام اردو کانفرنس

● حیدرآباد۔ 8 اگست، کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام 30 اور 31 جولائی کو بمقام انگلو یونیورسٹی آڈیٹوریم پبلک گارڈن ناپلی حیدرآباد میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ جناب محمد جلیل پاشا، بانی وصدر نشیں کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر صدارت قرارداد کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس 29 جولائی 2007 کو منعقد ہوا جس میں مرکزی سطح پر اردو کے کئی دیرینہ حل طلب مسائل پر غور وخوض کیا گیا اور حسب ذیل قراردادوں کو تقطیعت دی گئی جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

آزادی کے بعد سے آج تک مرکزی سطح پر اردو کے لیے کوئی قومی پالیسی نہیں بنائی گئی۔ کمیٹی حکومت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے فوری طور پر ایک قومی پالیسی بنائی جائے۔

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی، وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے اعلان کردہ پندرہ نکاتی پروگرام کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید کرتی ہے کہ سرکاری مشنری اس پروگرام کی عمل آوری کو یقینی بنائے گی۔ خاص طور پر اردو زبان کی ترقی، اردو مدارس کے قیام اور استحکام کے سلسلے میں جن اقدامات کا ذکر کیا گیا وہ اردو

والوں کے لیے باعث اطمینان ہیں۔ اردو تعلیمی کمیٹی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہر ریاست میں پندرہ نکاتی پروگرام کی عمل آوری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے اور نگران کار مشنری قائم کرے۔

عالمی اردو کانفرنس کی تجویز ہے کہ مرکزی وزارت کے اقلیتی امور میں ایک اردو سیل قائم کیا جائے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو تنظیموں اور رضا کارانہ اداروں سے تال میل قائم کرے اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے مرکزی حکومت کو مختلف اقدامات کی ترغیب دے۔

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی مرکزی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کو قومی یوم تعلیم قرار دیتے ہوئے سرکاری طور پر اس کا اعلان کرے۔ آندھرا پردیش حکومت نے پہلے ہی ریاست میں یوم قومی تعلیم منانے کا اعلان کیا ہے جس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔

کمیٹی پلاننگ کمیشن سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ملک میں اردو زبان کی ترقی کے لیے ایک سو کروڑ روپے مختص کرے۔

کمیٹی آندھرا پردیش کے علاوہ ملک کی ہر ریاست میں اردو سرکاری زبان کمیشن کے قیام کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ تمام سرکاری احکامات اور پالیسیوں کی عمل آوری کو ممکن بنایا جاسکے۔

کمیٹی مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی حیدرآباد کی طرز پر رامپور یا پونے میں بھی ایک مرکزی اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ شمالی ہند کے اردو داں عوام کے احساسات و جذبات کی پذیرائی ہو سکے۔

کمیٹی مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت کے کیندریہ ودیالیہ، نوودے ودیالیہ اسکولوں، کستوربہ گاندھی اقامتی اسکولوں اور انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کو زبان اول کے طور پر رائج کیا جائے۔ اس کے لیے 20 کے بجائے 10 طلبہ کی شرط رکھی جائے۔

فروغ اردو کونسل کا قیام حیدرآباد میں 8 فروری کو عمل میں لایا گیا تھا۔ کمیٹی مطالبہ کرتی ہے کہ کونسل کے جنوبی مرکز کو مزید استحکام اور وسعت دی جائے۔

اردو رسم الخط کے تحفظ اور اس کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی جائے۔

نئی تعلیمی پالیسی اور سہ لسانی فارمولے میں اردو کے موقف کو واضح کیا جائے۔

تمام قومیائے ہوئے بینکوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ تمام اسکیمیں اردو میں بھی شائع کریں۔

اردو میڈیم کے پرائمری، اپر پرائمری، ہائی اسکول، جونیئر و ڈگری پی جی کالج اور اقامتی اسکولوں کے طلبہ اور طالبات کو پی سی، ایس ٹی۔ ایس سی طلبہ کے مماثل لازمی طور پر وظیفے دیے جائیں اور کمپیوٹر ایجوکیشن کو فروغ دینے کے لیے طلبہ و طالبات کو ترغیبات دی جائیں۔

تعلیم اور ملازمت کے تمام اشتہارات اردو اخبارات میں بھی شائع کیے جائیں اور اردو اخبارات کے لیے سرکاری اشتہارات کا 40% فیصد حصہ مختص کیا جائے۔

دوردرشن کا قومی اردو چینل شروع کیا گیا ہے لیکن اس چینل کے پروگراموں سے ملک بھر کے عوام محروم ہیں اس سلسلے میں وزارت اطلاعات کو فوری اقدامات کرنے چاہئیں۔ (ڈاک سے)

پٹنہ یونیورسٹی میں اردو جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن کے ایک سالہ ڈپلوما کورس کا آغاز

● پٹنہ۔ 19 جولائی، الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں تربیت یافتہ اردو صحافیوں کی زبردست مانگ کے پیش نظر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ میں رواں تعلیمی سال سے ایک نئے پروفیشنل کورس ''پی جی ڈپلوما ان اردو جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن'' کا آغاز ہونے جارہا ہے۔ اہل اردو کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کا یہ تاریخی اقدام نہ صرف فال نیک بلکہ الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں اردو صحافیوں کی بڑھتی ہوئی زبردست مانگ کی تکمیل میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا۔

یہ اطلاع شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ کے صدر اور پی۔ جی۔ ڈپلوما کورس کے ڈائرکٹر پروفیسر اسرائیل رضا نے دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں روزگار کے وافر امکانات ہیں جہاں تربیت یافتہ اردو صحافیوں کی زبردست مانگ ہے۔ الکٹرانک میڈیا میں نت نئے اردو چینل شروع کیے جارہے ہیں جبکہ پہلے سے بھی کئی اردو چینل کام کررہے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کا بھی دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے چنانچہ ان شعبوں میں تربیت یافتہ اردو صحافیوں کی مانگ بڑھ رہی ہے مگر ملک بھر میں صرف دو تین یونیورسٹیاں ہی ایسی ہیں جہاں اردو صحافیوں کی تربیت کا نظم ہے نتیجتاً الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں تربیت یافتہ اردو صحافیوں کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ اسی کے پیش نظر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی نے اردو جرنلزم اور ماس کمیونکیشن میں پی جی ڈپلوما جیسے پروفیشنل کورس شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس پر پٹنہ یونیورسٹی کے معزز وائس چانسلر پروفیسر وائی۔ سی۔ سیمادری کی فعال قیادت میں اکیڈمک کونسل اور پٹنہ یونیورسٹی کے چانسلر، عزت مآب گورنر شری آر۔ ایس۔ گوئی نے اپنی اپنی تصدیق کی مہر ثبت کردی۔ اس نئے ایک سالہ ڈپلوما کورس کا آئندہ 3 ستمبر سے

آغاز ہونے جارہا ہے۔ امید ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی کے عزت مآب چانسلر اور معزز وائس چانسلر کے اس فیصلے کا اردو حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

پروفیسر اسرائیل رضا نے مزید بتایا کہ اس ایک سالہ پی.جی.ڈپلوما کورس میں داخلے کے لیے فارم اور پراسپکٹس شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ کے دفتر میں 23 جولائی سے 14 اگست 2007 تک کسی بھی کام کے دن دفتری اوقات کے دوران دستیاب ہوں گے۔ 31 اگست تک داخلے کا عمل مکمل ہوجائے گا اور 3 ستمبر سے اس کورس کی باضابطہ کلاسیز شروع ہوجائیں گی۔ اس ڈپلوما کورس میں داخلے کے لیے وہی امیدوار اہل ہوں گے جو کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے اردو کے ساتھ بی.اے.، بی.کام، بی.ایس.سی. یا اس کے مساوی امتحان پاس ہیں۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والے اردو صحافت سے وابستہ گریجویٹ بھی درخواست دینے کے اہل ہیں۔ داخلہ تحریری و زبانی امتحانات میں حاصل شدہ نمبروں کی بنیاد پر ہوگا۔ درخواست کا فارم اور پراسپکٹس دو سو پچاس روپے کا بینک ڈرافٹ جو کہ "ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف اردو" پٹنہ یونیورسٹی کے حق میں قابل ادا ہو، جمع کرنے پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی طرح کی اطلاع شعبۂ اردو کے دفتر سے یا فون نمبر 0612-2660323 پر رابطہ قائم کرکے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (ڈاک سے)

ادب کا بنیادی مقصد ـــ فلاحِ انسانیت

● نئی دہلی۔ ادب کا لفظ سلیقہ شعاری سے عبارت ہے، انسانی احساسات و جذبات کی دلکش ترجمانی اور مؤثر تصویر کشی کا نام ادب ہے، جس کا فرض اولین الفاظ و معانی کے حسنِ امتزاج سے اخلاق و کردار کی تحسین اور سماجی اصلاح ہے۔ ان خیالات کا اظہار ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے یہاں رابطۂ ادب اسلامی ہند کے دفتر جامعہ نگر، نئی دہلی میں اپنے خطاب کے دوران کیا۔ مولانا موصوف نے کہا کہ لوگوں نے ذاتی اغراض اور سطحی مقاصد کے تحت ادب کو اس کے حقیقی مفہوم سے ایک کرکے ہوا و ہوس کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا ہے اور اس طرح انھوں نے ادب کے حقیقی مفہوم کا اغوا کرلیا ہے۔ اہلِ قلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے قلم کی طاقت سے روحانی سکون کا راستہ دکھائیں۔

رابطۂ ادب اسلامی کی ہندوستانی شاخ کے صدر پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی نے رابطہ کے اغراض و مقاصد اور اس کی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد شاعری، افسانہ، ناول اور ڈراما نیز دیگر ادبی اصناف کے ذریعے انسان کو اس کی فطری ادبی تسکین فراہم کرتے ہوئے شائستگی اور حسنِ اخلاق سے آراستہ کرنا ہے۔

صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے ادب کے نام پر پھیلی ہوئی بے ادبی پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ حقیقت کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ ادیب، معلم اور نبی کی منزل ایک ہی ہے اور وہ ہے بدی اور باطل کے سپولوں کے زہر کو ادبی نگارشات کی ضربِ کلیمی سے بے اثر کردینے کی تڑپ۔ جانب دارانہ ادبی تنقید کو معروضیت سے مزین کرنے کی تلقین کرتے ہوئے انھوں نے یاد دلایا کہ بانی رابطہ مولانا ابوالحسن علی ندوی فرمایا کرتے تھے: "ادبی جمال کا ظہور کہیں بھی ہو جمال ہی رہے گا۔ پھول تو پھول ہی کہلائے گا، وہ کہیں بھی کھلے، مسجد، مندر، میخانے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی قید نہیں، جودتِ فکر اور جمالِ فن کہیں بھی نظر آئے، مستحق تحسین اور قابلِ قدر افزائی ہوگی۔ عصر حاضر کا یہ وطیرہ معروضیت اور معقولیت کی راہ سے منحرف ہے کہ ادبی جمال کا مظاہرہ میخانے کی فضا میں ہوتو اس کی قدر افزائی ہوتی ہے اور اگر اسی طرح کا ادبی جمال عبادت گاہوں کے روحانی ماحول کے تناظر میں ہوتو اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ درحقیقت ادب کے ذریعے روحانی سکون کی بہار آفریں فضاؤں سے محظوظ ہونے کی کوشش اور اس کے تئیں بیداری اور تڑپ پیدا کرنے کی جدوجہد ناگزیر ہے۔ بقولِ اقبال:

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد کے پروفیسر محسن عثمانی نے ادب اور اخلاقی اقدار کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا اور ادب اور اخلاق کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے معتمد تعلیمات، پندرہ روزہ عربی اخبار "الرائد" اور عربی ماہوار مجلّہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے کہا کہ اسلامی ادب عالم گیر فطرتِ انسانی اور حسنِ اخلاق کے تعمیری تصورات کو دلکش اسلوب میں عام کرکے انس و الفت کی خوش گوار فضا کے استوار کرنے کی جدوجہد کا نام ہے۔

جلسے کا آغاز ڈاکٹر نسیم اختر ندوی کی تلاوت اور ڈاکٹر تابش مہدی کی نعت سے ہوا۔ اہم شرکا میں مولانا سید محمود الحسن ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (حیدرآباد)، مولانا محمد کلیم صدیقی (پھلت)، ڈاکٹر محمد حلیم صدیقی، پروفیسر بدرالدین حافظ، ڈاکٹر نور الاسلام صدیقی، محمد غیاث الاسلام صدیقی ندوی، اجمل فاروق ندوی، حافظ سید محمد یوسف ندوی، نبیل احمد خاں، ڈاکٹر ابوالکلام محمد فاروق، ڈاکٹر عبدالماجد قاضی، پروفیسر محمد ایوب خان، نجم الہدیٰ خاں ندوی،

پروفیسر خالد حامدی، ڈاکٹر صہیب عالم صدیقی، ڈاکٹر ولی اختر ندوی، ڈاکٹر محمد قطب الدین ندوی (دہلی یونیورسٹی)، قمر شعبان ندوی، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن ندوی (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) اور سید قمر الحسن (ہمدرد یونیورسٹی) کے نام شامل ہیں۔
(ڈاک سے)

میر و غالب کے شہر میں اردو کو اپنا حق مانگنا پڑ رہا ہے

● نئی دہلی۔ 25 جولائی، میر و غالب کے شہر میں اردو کو اپنا حق مانگنا پڑ رہا ہے۔ یہ بے حد شرم اور افسوس کی بات ہے۔ جو شخص اپنی مادری زبان نہیں جانتا وہ دنیا کی کسی زبان میں ماہر نہیں ہوسکتا اور مانگنے سے صرف بھیک ملتی ہے حق نہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنا اور اردو کا حق لینا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے اردو پریس کلب کی جانب سے آج پریس کلب آف انڈیا میں ''دہلی سرکار بنام اردو'' کے عنوان سے منعقد سمپوزیم کے دوران کیا۔ پروگرام کی صدارت ممبر پارلیمنٹ اے آر شاہین نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شعیب رضا نے انجام دیے۔ اس موقع پر ایم حسنین، سعدیہ دہلوی، جاوید حبیب، حبیب احمد اور فیروز بخت سمیت متعدد معزز شخصیات موجود تھیں۔

ایم حسنین نے اردو کے تئیں بے حسی اور بے رخی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ دنیا میں انگریزی زبان کی ہی اجارہ داری ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ چین، جاپان، جرمنی، فرانس وغیرہ جیسے ممالک اپنی مادری زبان کی بنیاد پر ہی اتنی ترقی کر پائے ہیں۔ وہیں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کی حالت ہمارے سامنے ہے جہاں لوگ انگریزی کو فوقیت دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مایاوتی نے مرکز سے اتر پردیش کے لیے 80 ہزار کروڑ روپئے کا مطالبہ کیا ہے۔ آج مسلمانوں کی آبادی اتر پردیش کی کل آبادی سے کہیں زیادہ ہے کیا ہمارا کوئی قائد ہے جو اس طرح کا مطالبہ کرسکے۔ فیروز بخت نے کہا کہ اردو کو اس کا حق جذباتیت سے نہیں ملے گا ہمیں انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ سعدیہ دہلوی نے کہا کہ ہمیں اردو کو اس کا حق دلانے کی مہم کو سڑکوں پر لانا ہوگا اور اس سے عام آدمی کو جوڑنا ہوگا، اگر پھر بھی اردو کو اس کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے تو ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ جے این یو کے پروفیسر ماتھر نے کہا کہ ہمیں زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کی ترقی کے لیے عملی قدم اٹھانے ہوں گے۔ حشم الدین نے تفصیل سے اردو کی حالت زار پر روشنی ڈالتے ہوئے دہلی سرکار کی اردو کے تئیں سرد مہری کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے اسکولوں میں 1995 کے بعد سے ایک بھی اردو ٹیچر کی تقرری نہیں کی گئی۔ اتنا ہی نہیں ان کی جو آسامیاں خالی تھیں انھیں ہندی کے ٹیچروں کی تقرری کرکے پورا کیا گیا۔ سرکار کی جانب سے اردو میں نصاب کی کتابیں نہ تو خریدی جارہی ہیں اور نہ ہی فراہم کی گئیں۔ اسلم خاں، حبیب احمد، شعیب مرزا، طارق فیضی اور سید اقبال وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ جاری

● علی گڑھ۔ 4 اگست، اردو کے تئیں سرکار اور محکمہ تعلیم کی ایک اور بے توجہی سامنے آئی ہے۔ شکشا متروں کی تربیت کے دوران اردو کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔ تربیت کے موڈیول میں حساب، ہندی اور ماحولیات وغیرہ کا تو ذکر کیا گیا ہے مگر اردو پڑھانے والے شکشا متروں کے لیے موڈیول میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کے سبب ایسے زیر تربیت شکشا متروں کو مشکلات کا سامنا ہے جو اردو میڈیم اسکولوں میں بچوں کو پڑھائیں گے۔ سوال یہی اٹھتا ہے کہ اگر انھیں اردو میں تربیت نہیں دی گئی تو وہ کس طرح اردو میڈیم بچوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے؟ یہاں میرٹھ میں زیر تربیت کچھ شکشا متروں نے باقاعدہ اس کی شکایت کی ہے۔ مگر سینٹر انچارج ان کے مطالبے پر عمل کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ صرف نصاب کے مطابق ہی تربیت دلانے پر مجبور ہیں۔ حکومت وقتاً فوقتاً شکشا متروں کی بھرتی کرتی ہے۔ اس وقت شہری علاقوں میں واقع سرکاری اسکولوں کے لیے شکشا متروں کو تربیت دی جارہی ہے۔ میرٹھ شہر کے 80 وارڈوں کے کل 176 اسکولوں کے لیے 249 شکشا متر چار سینٹروں میں زیر تربیت ہیں۔ یکم اگست سے شروع ہوا تربیتی پروگرام 30 اگست تک جاری رہے گا۔ 176 اسکولوں میں سے 146 پرائمری اور بقیہ 30 جونیئر ہائی اسکول ہیں۔ میرٹھ شہر میں کل 28 اردو میڈیم اسکول ہیں۔ ان میں سے 13 اسکولوں کے لیے اردو میڈیم شکشا متروں کی تربیت جاری ہے۔ ان کے علاوہ ایک مضمون کے طور پر اردو پڑھانے والے 23 شکشا متر بھی تربیت حاصل کررہے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اردو میڈیم کے ان شکشا متروں کو بھی دیگر شکشا متروں کے ساتھ تربیت دی جارہی ہے۔ ان کے لیے الگ سے تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جس نصاب کے تحت انھیں تربیت دی جارہی ہے اس میں اردو کا نہ تو کہیں ذکر کیا گیا ہے اور نہ ہی اردو کا کوئی لفظ ہی موجود ہے۔ سنساد ھن کیندر پورا اہیران میرٹھ مرکز پر اردو میڈیم کے لیے زیر تربیت شکشا متر محمد عثمان، محمد انعام، حنا کوثر، تبسم اور ممتاز وغیرہ نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سینٹر پر کل 61 شکشا متر زیر تربیت ہیں۔ سینٹر کے انچارج تاراچند آریہ کا کہنا ہے کہ اردو کی تربیت دلانے میں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر متعلقہ افسران اس کے تعلق سے احکامات اور نصاب جاری کریں۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

امبیڈکر کالج اور شیام لال کالج اردو شعبے سے محروم

● نئی دہلی۔ 17 جولائی، دہلی حکومت اردو کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے وعدے کرتی ہے لیکن عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو کے فروغ کے سلسلے میں سرکار کس قدر سنجیدہ ہے۔ دہلی میں اردو میڈیم اسکولوں کی جو صورت حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دوسری سرکاری زبان ہونے کے تحت سرکاری دفاتر میں اردو کا جو نظام ہونا چاہیے وہ بھی نہیں ہے۔ حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ سرکار جمنا پار میں اردو کو فروغ دینے کے لیے کافی بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ حکومت کے اس دعوے کے باوجود جمنا پار کے دو کالج آج تک اردو کے شعبے سے محروم ہیں۔ امبیڈکر کالج اور شیام لال کالج میں تمام کوششوں کے باوجود آج تک اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہو سکی ہے جس کی وجہ سے جمنا پار کے اردو پڑھنے والے طلبہ کو خاصی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں کالج دہلی یونیورسٹی سے ملحق ہیں لیکن یہ دہلی انتظامیہ کے تحت آتے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ان کالجوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے گذشتہ برسوں سے کوشش ہو رہی ہے لیکن دہلی حکومت اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہی ہے حالانکہ اگر وہ ذرا سی دلچسپی لے لے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ جمنا پار علاقے میں اردو پڑھنے والوں کی خاصی بڑی آبادی ہے لہٰذا ان کالجوں میں اردو اساتذہ کی تقرری ناگزیر ہے۔ وہاں کے اردو پڑھنے والوں کے ساتھ یہ زیادتی ہے کہ انھیں اردو پڑھنے کے لیے دوسرے کالجوں میں داخلہ لینا پڑ رہا ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

اردو میڈیم اسکول ہی اردو زبان کی بقا کی ضمانت ہیں

● نئی دہلی۔ 2 اگست، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ اردو میڈیم اسکول ہی اردو زبان کی ترقی اور بقا کی ضمانت ہیں، یہاں فروغ اردو کانفرنس میں ہر ریاست میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کو لازمی بنانے، ریاستی حکومتوں کو ان اسکولوں کی خستہ حالی کے جوابدہ بنانے پر زور دیا گیا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام اس کانفرنس میں اتفاق رائے سے اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں کتابیں اور یونیفارم بھی مفت فراہم کی جائیں اور بچوں کے لیے معقول وظائف کا بھی انتظام کیا جائے۔ مرکزی یونانی طبی آرگنائزیشن، جدید اردو پریس کلب، انجمن فروغ ادب، انجمن اطبائے قدیم اور غالب ایجوکیشن سوسائٹی کے تعاون سے منعقدہ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر لال بہادر نے کہا کہ اردو کے فروغ کو ہندی یا انگریزی یا کسی اور زبان کی مخالفت پر محمول نہ کیا جائے۔ انھوں نے اردو میڈیم اسکولوں کے بغیر اردو کی تعلیم و ترقی کا خواب دیکھنے والوں کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کا قیام، ان کے معیار کو بڑھانے، کتابیں فراہم کرنے اور اساتذہ کی تقرری، سب ذمے داریاں حکومت کی ہیں۔ اس موقع پر ماہنامہ ''جرائم'' کے ایڈیٹر حفیظ الرحمٰن خاں، ڈاکٹر سید احمد خاں، پروفیسر کلدیپ سنگھ، ڈاکٹر محمد شمعون، صحافی آلوک شرما اور دوسروں نے بھی اظہار خیال کیا۔ (اخبار مشرق، دہلی)

11 ہزار اردو ٹیچروں کا تقرر

● لکھی سرائے۔ 11 جولائی، این ڈی اے حکومت نے بہار میں 11 ہزار اردو ٹیچروں کا اب تک تقرر کیا ہے اور 3 ہزار اور اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں آئے گی جس کی کارروائی شروع کی جا چکی ہے ساتھ ہی لکھی سرائے میں عنقریب قلیتی ہاسٹل کی تعمیر کا کام بھی پورا کر لیا جائے گا۔ مذکورہ باتیں ریاستی سطح کی 15 نکاتی وزیر اعظم فلاحی پروگرام کمیٹی کے نائب صدر ڈاکٹر اصغر شمسی نے ایک پریس کانفرنس کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے سبھی مدرسوں میں کمپیوٹر اور اقلیتی طلبہ کو اردو کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم دی جائے گی۔ میٹنگ کے بعد نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے ڈاکٹر شمسی نے کہا کہ یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ آر جے ڈی کے 15 سالہ دور اقتدار میں ریاست کے مسلمانوں کا صرف استحصال ہی نہیں ہوا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کمیونٹی کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر شمسی نے مزید کہا کہ آنے والے دنوں میں اقلیتی طبقے کا وقار بلند ہوگا اور تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے حکومت ایک ساتھ کئی پہلوؤں پر غور کر رہی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کئی ادارے اسکالرشپ دینے کو تیار، لینے والا چاہیے

● آسنسول۔ 24 جولائی، ذہین اور غریب طلبہ جو معاشی تنگی کی وجہ سے اپنی تعلیم کو ترک کرنے پر مجبور ہیں ایسے طلبہ کی امداد کے لیے ملک کی بہت سی تنظیمیں اور ادارے تیار ہیں مگر طلبہ کو اس کی جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے وہ مستفیض نہیں ہو پا رہے ہیں۔ آسنسول و مضافات کے طلبہ و طالبات کی معلومات کے لیے کچھ ضروری باتیں درج کی جا رہی ہیں۔ نئی دہلی کا مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن ذہین طلبہ کو مولانا آزاد نیشنل اسکالرشپ دیتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ درخواست کنندہ طلبہ و طالبات نے بورڈ کے امتحان میں کم از کم 55 فی صد مارکس حاصل کیے ہوں اور کنبے کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے کم ہو ساتھ ہی درجہ یازدہم یا کسی ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا ہو۔ ان کے

لیے درخواست دینے کی آخری تاریخ 30 ستمبر ہے اسی طرح مغربی بنگال مائنارٹیز ڈیولپمنٹ اینڈ فائنس کارپوریشن، کولکاتا، غریب اور ذہین طالب علموں کو جو مدھیامک میں 65فی صد نمبر لائے ہوں اور کنبے کی آمدنی 60ہزار سالانہ ہو، ہائرسیکنڈری میں زیر تعلیم ہوں یا ہائرسیکنڈری امتحان میں 60فی صد مارکس حاصل کرکے گریجویشن کررہے ہوں یا گریجویشن میں 55فی صد مارکس حاصل کرکے آگے تعلیم حاصل کررہے ہوں، درخواست دے سکتے ہیں۔ درخواست دینے کی آخری تاریخ 16 اگست ہے۔ اس کے علاوہ آئی ڈی بی اسکالرشپ پروگرام کے تحت ذہین اور ضرورت مند مسلم طالب علموں کو میڈیکل یا انجینئرنگ یا اسی طرح کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بغیر سود کے قرض مہیا کرایا جاتا ہے لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ ہائرسیکنڈری امتحان میں 60فی صد اور لازمی سبجیکٹ فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، حساب اور انگریزی رہے ہوں۔ درخواست جمع کرنے کی آخری تاریخ 5اکتوبر 2007 ہے۔ اس سلسلے میں فارم اور تفصیلی معلومات ڈاکٹر عبدالکلام ایجوکیشنل سوسائٹی، اقبال روڈ، رحمت نگر برن سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سوسائٹی ہذا کے سکریٹری شجاعت حسین سے فون پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔ فون نمبر 0341-3294132 موبائل نمبر 9933446051۔ (اخبار مشرق، دہلی)

انجمن فروغ اردو کے نئے سینٹر کا افتتاح

● میرٹھ۔ 6اگست، انجمن فروغ اردو نے شہر میں اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کی سمت میں ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے چوتھے سینٹر کا افتتاح کیا ہے۔ پٹواری کیمپس میں کھلے اس سینٹر پر 15سال سے زائد عمر کے ایسے افراد اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ سکتے ہیں جو کسی وجہ سے اس زبان سے ناآشنا ہیں۔ مرکز کا افتتاح ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ اس موقع پر ایک پروگرام کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر نسیم الدین صدیقی نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اساتذہ اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ صدارت انجمن کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے مراکز کا مقصد محض مسلمانوں کو ہی اردو سے روشناس کرانا نہیں بلکہ ان کے دروازے غیر مسلم لوگوں کے لیے بھی کھلے ہیں۔ ارتضیٰ کریم نے پورے ملک میں اس طرح کے مراکز کھولے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ قاری شفیق الرحمٰن نے کہا کہ قرآن کا مفہوم اور مذہب اسلام کو سمجھنے اور صحیح طریقے سے اس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اردو کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ انجمن کے نائب صدر آفاق احمد خاں نے کہا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ ذیشان خاں نے ملک کے تمام لوگوں سے اپیل کی کہ وہ دیگر تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو اردو بھی سکھائیں اس سے قبل سعید احمد نے تلاوت کلام پاک کے ساتھ پروگرام کا آغاز کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ارشد، اشرف خاں، مشاہد خاں، گلزار، فرحان احمد، شاداب وغیرہ موجود تھے۔ (اخبار مشرق، دہلی)

مشاعرے گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد ہیں

● نئی دہلی۔ 5اگست، ہندوستان میں منعقد ہونے والے مشاعرے آج بھی گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد ہیں۔ ان مشاعروں کے ذریعے ہم بڑی آسانی سے لوگوں تک امن کا پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈی جی آئی سی سی آر پون ورما نے کیا۔ وہ جشن بہار ٹرسٹ کی جانب سے سری فورٹ آڈیٹوریم میں منعقدہ ہندوپاک مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے دیوناگری رسم الخط میں میر کے منتخب کلام کے مجموعے کا بھی اجرا کیا اور کہا کہ اس طرح یقیناً اردو شاعری کو وسعت ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ میر کے یہاں جو سادگی ہے جو فکر ہے وہ کسی میں نہیں ہے۔ مشاعرے کا افتتاح پٹرولیم کے مرکزی وزیر منی شنکر ایئر نے کیا اور مشاعرے کے لیے ادارہ جشن بہار ٹرسٹ کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اچھی روایت ہے جسے باقی رہنا چاہیے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم رہے۔ مشاعرے کی کنوینر کامنا پرساد نے استقبالیہ تقریر کی اور کہا کہ ہمارے بزرگوں نے اس زبان اور روایت کی مذہبی اور علاقائی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر پرورش کی ہے انھوں نے کہا کہ اردو وہ زبان ہے جس میں مختلف زبانوں کا ادب ہار کی مانند پرو دیا ہوا ہے۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر پروفیسر شہریار نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مہدی جعفر نے انجام دیے۔ مشاعرے میں احمد فراز، رخسانہ نازی راولپنڈی، فرخ زہرہ گیلانی لاہور، گلنار آفریں کراچی، عزم بہزاد کراچی، عمر سلیم ایم، جدہ خورشید رہبین افغانستان، فدا فاضلی ممبئی، منور رانا کولکاتا، ساغر خیامی لکھنؤ، ملکہ نسیم جے پور، جانی فاسٹر علی گڑھ، شین۔ کاف۔ نظام جودھ پور، نوری پروین کانپور، شاعر جمالی کانپور، شکھا شریواستو غازی پور، سندر مالیگاؤں اور اقبال اشہر دہلی نے اپنے کلام پیش کیے۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

ادیب کو اپنی مٹی سے جڑا ہونا چاہیے

● نئی دہلی۔ 30جولائی، پاکستان کے معیاری ادبی رسالے ''ادب عالیہ'' کے چیف ایڈیٹر اور شاعر ریاض ہانس نے کہا کہ وہ ہندوستان آکر اجنبیت محسوس نہیں کررہے ہیں بلکہ یہاں انھیں اپنے پن کا احساس ہورہا

ہے۔ وہ یہاں جہاں بھی گئے ہر جگہ ان کا خیر مقدم خلوص کے ساتھ کیا گیا۔ لوگوں کے برتاؤ میں اردو زبان کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں معافی و شاعر ہانس نے کہا ''ادیب کو اپنی مٹی سے جڑا ہونا چاہیے۔ میری شاعری میں آپ کو پنجاب اور چناب کی خوشبو محسوس ہوگی۔'' اس سوال کے جواب میں کہ وہ خود کو ترقی پسند، جدید یا مابعد جدید کیا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میں ترقی پسند ہوں لیکن جدت اور تجربے کو بھی اہمیت دیتا ہوں۔ ایک اور سوال کے جواب میں ریاض ہانس نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں قابل ستائش ادبی سرگرمیاں جاری ہیں اور معیاری نثری و شعری تخلیقات منظر عام پر آرہی ہیں۔ رائٹر فاؤنڈیشن پاکستان کے چیئرمین ریاض ہانس نے بتایا کہ ان کی اس تنظیم کا مقصد عالمی پیمانے پر اردو زبان و ادب کو فروغ دینا ہے۔ لہٰذا رائٹر فاؤنڈیشن پاکستان ادبی کانفرنس، سیمینار، مشاعرے اور مذاکرات کا انعقاد کراتی رہتی ہے۔ سہ ماہی ''ادب عالیہ'' بھی اسی فاؤنڈیشن کی دین ہے۔ اس سہ ماہی میں ہندو پاک کے مستند ادیب و شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور محقق لکھتے ہیں اور اس کا سرکولیشن بھی بڑے پیمانے پر دنیا کے مختلف ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ طنز و مزاح کے سلسلے میں ریاض ہانس نے کہا کہ بدقسمتی سے اردو زبان میں چند ہی معیاری طنز و مزاح نگار بچے ہیں لیکن وہ مشتاق احمد یوسفی کے طنز و مزاح کو پسند کرتے ہیں اور ان سے اپنے سہ ماہی ''ادب عالیہ'' کے سلسلے میں مشورے بھی کرتے رہتے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سعودی عرب کے لوگوں میں اردو کے تئیں دلچسپی

● نئی دہلی۔ 3 اگست، سعودی عرب کے لوگوں میں اب سے پہلے اردو کے تئیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن گذشتہ کچھ سالوں میں صورت حال میں تبدیلی آئی ہے اور اب وہاں کے لوگ بھی اردو سیکھنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ بات سعودی عرب کے معروف عربی اور اردو شاعر عمر سالم بصار العیدروس نے خصوصی بات چیت کے دوران روزنامہ راشٹریہ سہارا کو بتائی۔ مشاعرہ جشن بہار میں شرکت کرنے آئے عمر سالم بصار العیدروس نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے بعد سعودی عرب میں سب سے زیادہ مشاعرے ہوتے ہیں۔ وہاں تقریباً 20 لاکھ پاکستانی اور 8 لاکھ ہندوستانی رہتے ہیں، جن کی صحبت سے سعودی شہریوں کو اردو میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعودی عرب میں ہندوستان اور پاکستان کے اسکولوں میں تو اردو کی تعلیم دی ہی جاتی ہے، لیکن جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں بھی اردو اور فارسی بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ عمر سالم بصار العیدروس بنیادی طور پر عربی کے شاعر ہیں اور وہ اپنے عربی کلام کو خود اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کے استاد تسلیم الٰہی زلفی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ عربی اور اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ دنیا بھر میں یہ پہلا ایسا شعری مجموعہ ہے جو عربی اور اردو میں ایک ساتھ ہے۔ عمر سالم بصار العیدروس کا کہنا ہے کہ وہ غزل کی شاعری ہی پسند کرتے ہیں اور ان کے نزدیک شاعری محبوب سے گفتگو کا نام ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ مرحوم خمار بارہ بنکوری سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ مشاعروں کے گرتے معیار کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کے لیے شاعروں کو ہی ذمے دار مانتے ہیں۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ میں اس کے مستقبل کے تئیں مایوس نہیں ہوں کیونکہ اب اردو ہندوستان یا پاکستان تک ہی محدود نہیں ہے۔ حال ہی میں نیویارک میں ایک بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہوا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

حکومتیں اہل قلم کو ویزے کی آسانیاں فراہم کرائیں

● نئی دہلی۔ 3 اگست، اردو آج کسی ایک ملک کی زبان نہیں رہ گئی ہے بلکہ اردو کے چاہنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ ایسے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ یہ بات پاکستان کی معروف شاعرہ محترمہ گلنار آفریں نے روزنامہ راشٹریہ سہارا سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران کہی۔ محترمہ گلنار آفریں نے ہندوستان۔ پاکستان تعلقات کے حوالے سے کہا کہ دونوں ہی ملکوں کے عوام کی دلی خواہش ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات مضبوط اور خوشگوار ہوں۔ 15 اگست 1947 کو راجستھان کے شہر ٹونک میں پیدا ہوئی گلنار آفریں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تو خون کے رشتے ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں سے درخواست کی کہ شعراء، ادبا اور فنکاروں کو ویزے کی خصوصی سہولیات مہیا کرائی جانی چاہیے کیونکہ اہل قلم تو محبتوں کا پیغام دینے کے لیے نکلتے ہیں۔ شاعری کے تعلق سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں اچھی شاعری ہو رہی ہے۔ غزل، نظم اور ہائیکو میں زبردست کام ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعری میں خواتین نے بھی اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ پروین شاکر کے بعد کس شاعرہ کو بڑی شاعرہ تصور کیا جائے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سب کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے لیکن اس وقت ادا جعفری کلاسیکل ادب میں ایک بڑا نام ہے۔ ہندوستان میں شاعرات کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر انھوں نے کہا کہ میں نے یہاں بہت زیادہ خواتین کو نہیں سنا لیکن جنھیں سنا اور پڑھا ہے ان میں نور جہاں ثروت سے کافی متاثر ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ہندوستان میں جنم لیا لیکن آج اردو کسی ایک ملک کی زبان نہیں رہ گئی

ہے بلکہ اردو کے چاہنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ گلنار آفریں کے اب تک پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جبکہ دو افسانوی مجموعے ''پلک پلک سمٹی رات'' اور ''پھول اور وہ'' بھی کافی مقبول ہوئے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہندوستان میں اچھی شاعری ہورہی ہے

● نئی دہلی۔ 4 اگست، ہندوستان ہو یا پاکستان اردو کا مستقبل دونوں جگہ تابناک ہے، انگریزی وقت کی ضرورت ہے اور روزگار کی زبان ہے اس لیے اس کی جانب نئی نسل کا رجحان لازمی ہے لیکن ہمیں اپنی زبان کو زندہ رکھنے کی ذمے داری بھی ادا کرنی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کی طنز و مزاح کی شاعرہ رخسانہ نازی نے روزنامہ راشٹریہ سہارا سے خصوصی بات چیت کے دوران کیا۔ پاکستان میں ادبی کتابوں کی اشاعت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کا کتابوں پر کافی اثر پڑا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کتابوں کی مقبولیت کم ہوئی ہے کیونکہ آج ہر شخص شارٹ کٹ چاہتا ہے۔ پاکستان میں احتجاجی شاعری کے تعلق سے ان کا کہنا تھا کہ وہاں شعرا اور ادیبوں کا حکومت کے خلاف احتجاج جاری ہے۔ احمد فراز نے اپنا ایوارڈ بھی واپس لوٹا دیا ہے۔ ہندوستان میں شاعری کے حوالے سے کیے گئے سوال پر رخسانہ نازی نے کہا کہ ہندوستان میں اس وقت اچھی اور معیاری شاعری ہورہی ہے۔ پاکستان کی شاعرات میں پروین شاکر کے بعد کون بڑی شاعرہ ہے؟ اس سوال پر ان کا کہنا تھا کہ پروین شاکر کے بعد کسی نے بھی ان کا مقام نہیں لیا حالانکہ کئی شاعرات نے اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ ہند و پاک تعلقات کے بارے میں انھوں نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان خون کا رشتہ ہے اور اس رشتے کو سرحدیں ختم نہیں کرسکتیں۔ دونوں ملکوں میں ویزے کی آسانیاں پیدا کی جانی چاہئیں تاکہ عوام کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل سکے۔ سنجیدہ شاعری ترک کرکے طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھنے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں نے طنز و مزاح کی شاعری ضرور شروع کی ہے لیکن سنجیدہ شاعری ترک نہیں کی ہے۔ میں نے دیکھا کہ طنز و مزاح کی شاعری میں دور دور تک کوئی شاعرہ نظر نہیں آرہی تو سوچا کہ چلو کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔ مجھے کامیابی ملی اور طنز و مزاح کے کلام کا مجموعہ ''کنوارا نہیں ملا'' نے داد و تحسین حاصل کی۔ ان کی سنجیدہ شاعری کے دو مجموعے ''تشنہ لب'' اور ''رتجگے'' منظر عام پر آچکے ہیں جبکہ نثر کی تین کتابیں ''تھوڑی سی بے وفائی'' ''پگھلتے موتی'' اور ''درد کی زنجیر'' بھی قارئین سے داد و تحسین وصول کرچکی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ہندوستانی شناخت کی علامت

● حیدرآباد۔ 31 جولائی، اردو زبان کی وجہ سے ہندوستان کی مختلف اقوام میں اتحاد قائم ہوا ہے اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں ہم آہنگی پیدا ہوئی ہے۔ اردو ایسی میٹھی زبان ہے کہ اس کی شیرینی سے دیگر زبانیں بولنے والے بھی اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ وزیر اغذیہ و سیول سپلائی منسٹر جناب کاسو وینکٹ ریڈی نے جو آج یہاں کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام اندرا پریہ درشنی کالج، ناپلی میں 29 ویں اردو کانفرنس سے مخاطب تھے، ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد ملک بھر میں اردو کا گہوارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 15 اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے اور اردو اقامتی اسکولوں کے قیام کا سہرا چیف منسٹر ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی کے سر جاتا ہے۔ صدر نشین کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی جناب جلیل پاشا نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو زبان کو ملک بھر میں بالخصوص ریاست مہاراشٹرا میں دوسری سرکاری زبان قرار دینے کی ضرورت ظاہر کی۔ پونے سے مدعو محترمہ ممتاز پیر بھائی نے کہا کہ کسی بھی قوم کی شناخت اس کی زبان سے ہوتی ہے اگر زبان ہی ختم ہوجائے تو قوم کی شناخت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی نے مرکزی حکومت اور تمام ریاستی حکومتوں سے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے اردو میڈیم طلبہ کو کتابیں فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ چینئی کے پروفیسر سجاد نے اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کو ضروری قرار دیا۔

(منصف، حیدرآباد)

اردو، دنیا کی تیسری بڑی زبان

● لندن۔ 27 جولائی، زبانوں سے متعلق حال ہی میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو کو تیسری بڑی زبان قرار دیا گیا ہے جو جنوب ایشیائی ممالک میں تیزی سے فروغ پارہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اردو زبان جنوب ایشیائی ممالک کے لوگوں کی ثقافتی زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے جس کی وجہ سے آج برصغیر سے باہر گلف، مشرق وسطیٰ، مغربی یورپ، سکینڈے نیوین ممالک، امریکہ اور کینیڈا میں بھی لاکھوں افراد اس کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر کی آزادی کے بعد اردو زبان نے جنوب ایشیائی ممالک میں تیزی سے فروغ پانا شروع کردیا تھا۔ اردو زبان ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش، افغانستان، نیپال اور مالدیپ میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

(سالار، بنگلور)

کامل و فاضل اسناد تسلیم

● اٹاوہ۔ 15 جولائی، عربی فارسی بورڈ اتر پردیش کے امتحانات کامل و فاضل کو مہاتما جیوتا پھولے روہیل کھنڈ یونیورسٹی نے بی۔ اے، ایم۔ اے۔ کے مساوی تسلیم کرلیا ہے۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے جوائنٹ سکریٹری اعلیٰ تعلیم جگن ناتھ پال کے بھیجے اپنے مراسلے میں یہ اطلاع دی۔ رجسٹرار کے اس مراسلے پر اعلیٰ تعلیم کے محکمے نے جاری اپنے حکمنامے کے ذریعے سکریٹری محکمہ اقلیتی فلاح و بہبود اتر پردیش اور رجسٹرار عربی فارسی امتحانات اتر پردیش کو مطلع کیا ہے۔

حکومت کے اس اقدام سے اہل مدارس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس سلسلے میں گزشتہ 3 جولائی کو ایک وفد نے افتخار احمد سے ملاقات کرکے مدارس کے مسائل پر مشتمل میمورنڈم پیش کیا تھا جس میں پینشن کے مسئلے پر سکریٹری اقلیتی فلاح بہبود نے فوراً جی او جاری کردیا تھا جب کہ باقی مسائل بھی جلد از جلد حل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کامل وفاضل کو بی۔ اے، ایم۔ اے۔ کے مساوی تسلیم کیے جانے کا حکمنامہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

(اخبار مشرق، دہلی)

اردو مجلس کا ادبی اجلاس

● حیدرآباد۔ 16 جولائی، اردو مجلس کے زیر اہتمام 14 جولائی کی شام منعقدہ ایک اجلاس میں جسٹس بلال نازکی نے اپنی آٹھ شعری تخلیقات پیش کیں جن پر مختلف شرکا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بلال نازکی ماہر قانون ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں اور انھوں نے نثری پیرا کے ساتھ ساتھ نظم معریٰ کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ کشمیری اور پنجابی بولنے والے اپنی زبان میں بات چیت کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نازکی کی ماوری زبان کشمیری ہے لیکن اردو سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے اور غالباً اسی لیے انھوں نے اردو زبان کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا اور کامیابی سے اپنے احساسات کو نظموں کے روپ میں پیش کیا۔ انھوں نے بلال نازکی کی تخلیقات میں پوشیدہ رموز اور علائم کی طرف توجہ دلائی۔ ابتدا میں جناب منظور الامین نے جسٹس بلال نازکی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا تعلق جس خانوادے سے ہے اس نے شعر و ادب کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے والد غلام رسول نازکی فارسی، اردو اور کشمیری کے ممتاز شاعر تھے اور بڑے بھائی فاروق نازکی بھی مشہور شاعر ہیں۔ جناب منظور الامین نے کہا کہ جسٹس بلال نازکی نے ابھی ابھی شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے اور انھوں نے ایک طرح نو کی بنیاد رکھی ہے۔ اردو شعر و ادب کو ان سے اچھی توقعات وابستہ رکھنی چاہئیں۔ محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ نے کہا کہ بلال نازکی شاعری کی دنیا میں نووارد ہیں لیکن ان کی کاوشیں قابل تعریف ہیں اور ان کی نظمیں دل کو چھو لیتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جیسے کسی سنگتراش کو پتھر میں مجسمہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح ایک ادیب اور شاعر کو اپنی تخلیق کا ہیولہ عام واقعات میں بھی نظر آجاتا ہے۔ جناب مظہر مہدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نثری نظم میں بحر کے سوا سب کچھ ہوتا ہے اور اعلیٰ شاعری کے امکانات پوری طرح موجود ہوتے ہیں۔ جسٹس بلال نازکی کی نظموں میں ایک خاص قسم کا تحیر ملتا ہے اور پوری نظم ایک استعارے کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے جسٹس بلال نازکی کی ایک نظم کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں جو نازک خیالی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک اچھا شاعر پوشیدہ ہے۔ جناب مصحف اقبال توصیفی نے بلال نازکی کی نظموں کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظمیں ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور ایک طرح سے ایک طویل نظم کے حصے محسوس ہوتے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے کئی سوالات ابھرتے ہیں، یہی شاعر کا کمال ہے۔ اس موقع پر ایم۔ اے۔ باری ایڈوکیٹ اور جناب کبیر احمد نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

جہالت دور کیے بغیر ترقی ناممکن

● علی گڑھ۔ 7 اگست، ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر، سید حامد نے کہا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے تشکیل دی گئی سچر کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کرانے کے لیے ملکی سطح پر ماحول تیار کرنے کے لیے اگر ضرورت پڑی تو ریلی کا اہتمام کیا جائے گا اور بھارتیہ جنتا پارٹی سمیت ملک بھر کی تمام سیاسی پارٹیوں اور سماجی تنظیموں کو بھی اعتماد میں لیا جائے گا۔ مسلمانوں میں بیداری لانے کے لیے سماجی تنظیموں کے ذریعے ہر ضلع میں فلاح و بہبود مرکز قائم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ سید حامد نے پریس کانفرنس میں کہا کہ سچر کمیٹی میں وہ بحیثیت رکن شامل تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مسلم تنظیموں میں شامل جماعت اسلامی جمعیۃ العلما، جماعت اہل حدیث، جماعت اتحاد المومنین مجلس مشاورت وغیرہ نے سچر کمیٹی کی سفارشات نافذ کرانے کی انھیں ذمے داری سونپی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ محض کمیٹی کی سفارشات کو نافذ ہی نہیں کرائیں گے بلکہ وزیر اعظم کی طرف سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو 15 نکاتی پروگرام شروع کرایا گیا ہے اس کو بھی رائج کرائیں گے۔ مسلمانوں کی تعلیم، صحت اور سماج میں سدھار وغیرہ پر بھی توجہ دی جائے گی۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ہم مسلمانوں کو ان کا حق ضرور دلائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ دیگر اقوام کی طرح مسلمان بھی سماج کا لازمی حصہ ہیں ایک حصہ اگر چھوٹ جائے گا

تو ملک کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے اہم پہلوؤں کا خلاصہ کرتے ہوئے سابقہ آئی اے ایس افسر نے کہا کہ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنا ہے تو انھیں سب سے پہلے جہالت کو دور کرنا ہوگا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کے لیے سہ لسانی فارمولہ پر مکمل درآمد ضروری

● فیض آباد۔6 اگست، اردو بچاؤ تحریک کے رہنما ڈاکٹر محمد حلیم نے اتر پردیش میں اردو کی بنیادی تعلیم پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں کہا کہ اردو کے گہوارے اتر پردیش میں اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ ہونے کی وجہ سے ریاست میں بنیادی تعلیم سے بھی اردو کو سہ لسانی فارمولہ کے تحت لازمی کرنے کا جی او (سرکاری حکم نامہ) جاری کروالیں اور یوپی اسمبلی میں بل پاس کرالیں تو یہ کام اردو کی ترقی کے لیے ہزاروں دروازے کھول دے گا۔ اس کام سے معلم اردو اور اردو پی ٹی سی کرنے والوں کے تمام مطالبوں کو حل کرنے کا دروازہ کھل جائے گا کیوں کہ اردو کو آٹھویں درجہ تک جس دن لازمی طور سے نافذ کیا جائے گا اس کے بعد سرکار کو دو لاکھ اردو اساتذہ کی ضرورت پڑے گی اور دس لاکھ اردو اساتذہ کو غیر سرکاری طور پر اردو سکھانے کے لیے کام ملے گا۔ اس طرح اردو کا رشتہ براہ راست روزی روٹی سے جڑ جائے گا، اردو ترقی کے راستے پر گامزن ہوجائے گی اور قومی ایکتا مضبوط ہوگی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پریم چند کے 127ویں یوم ولادت پر جلسہ

● علی گڑھ۔ 2 اگست، پریم چند کی 127ویں یوم پیدائش پر جنوادی لیکھک سنگھ کے زیر اہتمام ''پریم چند جینتی'' کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کے خصوصی مقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ پریم چند، جوش ملیح آبادی اور علامہ اقبال تین ایسے بڑے قلم کار ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے ہی ان سوالوں کو اٹھایا جو بعد میں ترقی پسند تحریک کے اہم موضوع بنے۔ ان دانشوروں نے دل کی آواز پر ہی اس قسم کے مسئلے اٹھائے۔

پروفیسر قاسمی نے کہا کہ سامراجیت کے دور میں بھی جب بڑے بڑے دانشوروں نے سامراجیت کی حمایت کی تھی تب پریم چند اور اکبر الٰہ آبادی جیسے بڑے دانشوروں نے کھل کر اس کی مخالفت کی۔ پریم چند کے ساتھ اردو میں ناانصافی ہوئی ہے کیونکہ کبھی ان کی تخلیقات کی روح کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ پریم چند نے اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ جس ڈھنگ سے کیا ہے وہ انوکھا ہے۔ پریم چند کے کفن سے ہی اردو میں نئی کہانی کا آغاز ہوا۔ ممتاز شاعر پروفیسر شہریار نے کہا کہ پریم چند کے یہاں جو عام انسان نظر آتا ہے وہ آج کے دور میں غائب ہوگیا ہے۔ آج اسی لیے پریم چند اور زیادہ اہم ہوگئے ہیں لیکن پریم چند نے ہمیں جو ہتھیار دیا ہے اسے کوئی چلانے والا نہیں ہے۔ پریم چند کی اہمیت اس لیے ہے کیوں کہ انھوں نے ادب کو عام انسان سے جوڑا۔ آرٹس فیکلٹی کے سابق ڈین پروفیسر کے پی سنگھ نے پریم چند کی تخلیقات کو قومی تحریک سے جوڑ کر دیکھنے کی بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں پریم چند نے اپنی تخلیقات میں عورتوں اور دلتوں کے مسائل کو بھی اہم مقام دیا ہے۔ ڈاکٹر مشکوٰۃ عابدی نے پریم چند پر ایک مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے پریم چند کے نامکمل ناول'' منگل سوتر'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند کی تخلیقات زندگی سے روبرو کراتی ہیں۔ پروگرام میں ڈاکٹر بدھ سین نہار، ڈاکٹر آشوتش کمار، وارشنی کالج کے شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر رمیش کمار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ڈاکٹر تسنیم سہیل نے کی جبکہ ڈاکٹر آر بی این شکلا نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

چوتھی عالمی اردو کانفرنس کا شکاگو میں انعقاد

● امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کے چودہ شہروں سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اخبار'' اردو ٹائمز'' کے زیر اہتمام شکاگو میں چوتھی اردو عالمی کانفرنس کامیابی کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔ اس کانفرنس میں اردو زبان کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس سے قبل بھی اردو ٹائمز نے اسی طرح کی تین عالمی اردو کانفرنسیں، نیویارک، ٹورنٹو اور لندن میں منعقد کی ہیں۔ اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ خطبۂ استقبالیہ کے لیے شکاگو میں مقیم ڈاکٹر مظفر فاروقی کو زحمت دی گئی۔ انھوں نے کانفرنس کے مقاصد کا احاطہ کیا اور'' اردو ٹائمز'' کے پبلشر اور ایڈیٹر انچیف خلیل الرحمٰن کو خراج تحسین پیش کیا۔ کانفرنس کا افتتاح اردو ترانے سے کیا گیا جو شکاگو میں مقیم قلمکار اور شاعر حشمت سہیل نے تحریر کیا تھا۔ اردو ٹائمز کے پبلشر خلیل الرحمٰن نے افتتاحی اجلاس میں مرکزی کمیٹی کے ہمراہ اردو کی شمع روشن کی اور اپنے خطاب میں اردو کانفرنس کے مقاصد کو اجاگر کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اگلے سال ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کا اعلان بھی کیا۔ انھوں نے ان تمام افراد کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اردو کانفرنس کے سلسلے میں تعاون کیا۔ اس کانفرنس میں امریکہ، کینیڈا، ہندوستان، برطانیہ، جرمنی اور پاکستان کے ممتاز شعرا اور ادبا بھی موجود تھے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، شاہد ماہلی، پروفیسر عبدالجلیل پٹھان، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور مصور و شاعر صادقی تشریف لائے تھے۔

پاکستان سے راجہ انور سہیل وڑائچ، امجد اسلام امجد، پروفیسر اصغر ندیم سید اور محسن احسان نے شرکت کی۔ دیگر شرکا میں محترمہ نیئر جہاں، شکیل رفیق، نسیمہ کلثوم، رضیہ فصیح الدین، مونا شہاب، نیلوفر عباسی، شفیعہ قادری، ضیاء الدین شکیب، "اردو ٹائمز" لندن کے منیجنگ ایڈیٹر ابراہیم چوہدری، مصطفیٰ شہاب، حنیف اخگر، حشمت سہیل، افتخار حیدر، امین حیدر، رضا الجبار، سید سردار علی، اقبال حیدر، پروین شیر، پروفیسر شمیم علیم اور قمر علی عباسی شامل تھے۔ (ڈاک سے)

لندن کی ایک خوشگوار شام

● لندن کے کوئنس ہوٹل کا جدید طرز سے آراستہ و پیراستہ ہال جس میں قرینے سے لگی کرسیوں پر چاروں طرف مسکراتے ہوئے چہرے۔ سنجیدہ و نیم سنجیدہ گفتگو، کوئنس ہوٹل کرسٹل پیلس، سرزمین اودھ کے فرزند گوہر نواب کی ملکیت ہے جہاں آج کی شام لندن کے اردو دوستوں شاعروں اور ادیبوں کے لیے خوشیوں کی سوغات لے کر آئی ہے جس کا اہتمام ماہنامہ "صدا" کے روح رواں اقبال مرزا نے کیا ہے۔ آج ان کی دو کتابوں کے علاوہ ماہنامہ "صدا" ہم عصر ادب نمبر کی رسم رونمائی ادا ہوئی ہے۔ ڈائس پر سب سے پہلے اقبال مرزا نمودار ہوئے۔ مائک ہاتھ میں اٹھا کر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اس جلسے کی غرض و غایت بیان کی اور حاضرین محفل کا استقبال کیا۔ پھر جلسے کی صدارت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کے نام کا اعلان کیا جو خاص طور پر اسی جلسے میں شرکت کے لیے لندن آئے ہیں۔ پھر دوسرے مہمانانِ خصوصی جناب شاہد ماہلی اور پروفیسر صادق کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ یہ دونوں حضرات بھی پرزور تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر تشریف لائے۔ ان کے بعد جناب صفدر جعفری اور محترمہ میمونہ چوگلے (جو کویت سے تشریف لائی تھیں) اور جناب صابر ارشاد عثمانی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ ان کی آمد کے بعد اسٹیج پر لگائی گئی تمام کرسیاں پر ہو گئیں۔

اس کے بعد اظہار خیال کے لیے جناب گوہر نواب کا نام پکارا گیا جو بعد ازاں ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں ماہنامہ "صدا" لندن کے ہم عصر نمبر کی رسم رونمائی انجام پائی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ ماہنامہ "صدا" نے گذشتہ بارہ تیرہ برسوں میں اردو شعر و ادب کی ترویج و ترقی کے خصوص میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں اور اپنی اشاعت کے اولین دور سے ہی تخلیقات کے معیار پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ صوری اور معنوی خوبیوں کے حامل اس رسالے کا ہم عصر نمبر بھی جس کی رونمائی آج عمل میں آئی ہے ایک یادگار شمارہ ہے جس میں برصغیر ہندو پاک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے قلم کاروں کی تحریریں اور ان کی تصویریں شامل ہیں۔ ان کے بعد ناظم جلسہ نے جناب شاہد ماہلی کا نام پکارا اور ان سے "اوراقِ صدا" کی رونمائی اور اظہار خیال کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے اقبال مرزا کی تازہ ترین کتاب "اوراقِ صدا" کی رسم رونمائی انجام دی۔ یہ کتاب ماہنامہ "صدا" کے گذشتہ شماروں سے منتخب کیے گئے اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ یہ کتاب گذشتہ ایک دہائی کے ان موضوعات و مسائل کا ریکارڈ ہے جن کا اردو اور اہل اردو سے گہرا تعلق ہے۔ جناب اقبال مرزا بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعری ہی ان کا پہلا عشق ہے لیکن ان کا شعری مجموعہ "جرس زندگی" کے نام سے اب منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کی رسم رونمائی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر صادق کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر موصوف نے اقبال مرزا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی غزلیں اور نظمیں اپنی مخصوص لسانی ساخت اور فکر و احساس کے ساتھ عصر حاضر کے تجربات حیات سے مملو ہیں۔ جناب صابر ارشاد عثمانی کی کتاب "مولانا محمد علی جوہر: حیات و خدمات" کی رسم رونمائی محترمہ میمونہ چوگلے نے انجام دی اور اپنے تاثرات پیش کیے۔ جناب آصف جیلانی نے مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات سے متعلق ایک مضمون پیش کیا۔ آخر میں خود مصنف کتاب جناب صابر ارشاد عثمانی نے اپنی کتاب پر روشنی ڈالی اور تقریب کی پہلی نشست اختتام کو پہنچی۔

ناظم جلسہ نے تمام حاضرین کو عشائیہ کے لیے مدعو کیا۔ عشائیہ کے بعد محفل مشاعرہ منعقد کی گئی اور جناب شاہد ماہلی کو کرسیِ صدارت سنبھالنے کی زحمت دی گئی۔ ان کے بعد مہمانانِ خصوصی پروفیسر صادق، ڈاکٹر مختار الدین مختار اور جناب اکبر حیدرآبادی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض جناب رشید منظر نے انجام دیے۔ جن شعرائے کرام نے مشاعرے میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

جناب شاہد ماہلی، پروفیسر صادق، ڈاکٹر مختار الدین مختار، جناب اکبر حیدرآبادی، ڈاکٹر اقبال مرزا، ڈاکٹر سالم جعفری، سید اشفاق حسین اشفاق، ڈاکٹر عبدالغفار عزم، جناب سوہن راہی، جناب عقیل دانش، مصطفیٰ شہاب، جناب آدم چغتائی، جناب ساحر شیوی، جناب رشید منظر، محترمہ محسنہ جیلانی، محترمہ پاکیزہ بیگ، محترمہ نجمہ عثمان، محترمہ شیریں برلاس، محترمہ رخسانہ رخشی اور جناب خالد فاروق وغیرہ۔ (ڈاک سے)

فیض احمد فیض کی بیٹی منزہ گل کو شملہ سرکار کا تحفہ

● نئی دہلی۔ 4 اگست، مشہور شاعر فیض احمد فیض کی بیٹی اور پاکستانی صحافی منزہ گل ہاشمی کو ان کی 61ویں سالگرہ پر شملہ سے ان کا برتھ سرٹیفکیٹ سالگرہ کے تحفے کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ یہاں سرکاری ذرائع نے بتایا کہ منزہ جب

سافٹا کانفرنس میں شرکت کے لیے شملہ آئی تھیں تب انھوں نے ہماچل پردیش کے وزیراعلیٰ ویربھدر سنگھ کو اپنا برتھ سرٹیفکیٹ فراہم کرانے میں مدد کرنے کی درخواست کی تھی۔ خیال رہے کہ منزہ کی پیدائش 22 اگست 1946 کو شملہ کے سیرینا انیکسی میں ہوئی تھی جب ان کے والد فیض احمد فیض اور والدہ ایلس فیض شملہ میں اپنی چھٹیاں منا رہے تھے۔ وزیراعلیٰ نے متعلقہ حکام کو ہدایت دی جس کے بعد آزادی سے پہلے کا پورا ریکارڈ تلاش کیا گیا اور شملہ میونسپلٹی نے منزہ کا برتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک کے ذریعے پاکستان بھیجا جارہا ہے۔ منزہ پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد نجی ٹیلی ویژن ''ہم'' ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

محبانِ اردو سے اپیل

● الٰہ آباد۔ 27 جولائی، ادبی و لسانی قومی تنظیم اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اردو سے محبت کرنے والوں سے اپیل کی ہے کہ اگر وہ اردو کی ترویج و اشاعت چاہتے ہیں تو بینک ڈرافٹ کے فارم بھی اردو میں پر کریں۔ تنظیم نے اردو میں بھرے گئے بینک ڈرافٹ فارم کی بنیاد پر اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی طرف سے جاری کردہ ڈرافٹ کی نقل یو این آئی کو فراہم کرتے ہوئے کہا کہ اگر بینک اردو میں بھرے گئے فارم کی بنیاد پر ڈرافٹ بنانے سے انکار کریں تو اس کی اطلاع تنظیم کو دی جائے تاکہ ایسے بینکوں کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کرائی جائے۔ تنظیم کے صدر محمد اختر چڑی والا نے کہا کہ ریزرو بینک آف انڈیا تمام بینکوں کو ہدایت دے چکا ہے کہ تمام بینک اردو میں بھرے چیک اور فارم قبول کرنے کے لیے اپنے اسٹاف بڑھائیں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو سے محبت کا دم بھرنے والے اور اردو کی روٹی کھانے والے ادیب و شاعر، دانشور، ڈاکٹر انجینئر، وکیل اور اساتذہ کو اپنی مادری زبان کی ترقی سے حقیقی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہوجائیں تو تمام سرکاری اداروں کو قانوناً اردو میں بھی اپنا کام کرانے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انجمن ترقی و بقائے اردو کے وفد کی ڈاکٹر علی جاوید سے نمائندگی

● حیدرآباد۔ 31 جولائی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید جو حیدرآباد میں موجود تھے ان کی قیام گاہ پر انجمن ترقی و بقائے اردو آندھراپردیش کی جانب سے ایک نمائندگی پیش کی گئی۔ اس وفد کی صدارت اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ نے کی۔ وفد میں الیاس طاہر، محمد کریم خاں، محمد نصیرالدین، سید اعجاز شامل تھے۔ وفد نے ڈاکٹر علی جاوید کو بتایا کہ آندھراپردیش میں اردو میڈیم کی نصابی کتابیں اسکول اور کالج کی سطح پر طلبہ کو بروقت نہیں ملتی ہیں۔ کبھی کبھی تو پورا تعلیمی سال گزر جاتا ہے اور کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے انجمن کے وفد کو یقین دیا کہ وہ اس ضمن میں ضروری کارروائی کریں گے اور جلد سے جلد ان کتابوں کی اشاعت کو یقینی بنانے کی کوشش کریں گے۔ (منصف، حیدرآباد)

مختصرات

● نئی دہلی۔ 17 جولائی، معروف اردو صحافی اور روزنامہ ''جدید خبر'' کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی کو وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے دور درشن کے اردو چینل کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ گذشتہ برس 15 اگست سے شروع ہونے والے اس اردو چینل کو ملک بھر کے اردو حلقوں میں مقبول بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اس سلسلے میں پرسار بھارتی نے زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ نمائندوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ معصوم مرادآبادی کی تقرری اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ وہ عرصے سے اردو زبان اور صحافت کے فروغ کی تحریک سے وابستہ ہیں۔

معصوم مرادآبادی نے جو دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کی پروگرام ایڈوائزری کمیٹی کے بھی رکن ہیں، بتایا کہ اردو چینل کو جلد از جلد 24 گھنٹے کا چینل بنانے کی کوشش میں حکومت سنجیدہ ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اردو کے فروغ میں اس چینل کا بھی ایک اہم کردار ہوگا۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے سکریٹری معصوم مرادآبادی ایک سرکردہ صحافی ہیں اور انھیں حال ہی میں دہلی اردو اکادمی نے ایوارڈ برائے صحافت سے نوازا ہے۔

● الٰہ آباد۔ 4 جولائی، ادارۂ سمتِ اردو کی جانب سے الٰہ آباد کے ادبی مرکز ''اردو گھر'' میں دہلی سے آئے ہوئے مہمان شاعر و ادیب ڈاکٹر احمد محفوظ کو استقبالیہ دیا گیا اور ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت جناب ایم۔اے۔ قدیر نے کی۔

مشاعرے سے قبل ماہنامہ ''سمتِ اردو'' کے مدیر جناب دانش الٰہ آبادی نے ادارے کی طرف سے ڈاکٹر احمد محفوظ کا خیر مقدم کیا۔ نیشنل اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری خواجہ جاوید اختر نے ڈاکٹر احمد محفوظ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ احمد محفوظ کا تعلق الٰہ آباد سے ہے، انھوں نے 1990

میں شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی سے ایم.اے. ٹاپ کرنے کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایم.فل اور پی.ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی اور 1997 میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر کے ہوا۔ گذشتہ دنوں احمد محفوظ نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ریڈر کا عہدہ حاصل کیا ہے اور ان کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

جناب ایم.اے.قدیر نے کہا کہ احمد محفوظ کو ان کی قابلیت اور ادبی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریڈر بنایا گیا ہے جس کے لیے احمد محفوظ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر کرنل اختر، حبیب رہبر، ڈاکٹر فاضل ہاشمی اور قمر الحسن صدیقی نے بھی مبارکباد پیش کی۔ حسیب رہبر، خواجہ جاوید اختر، احترام اسلام، انعام حنفی، تنویر سامانی، ڈاکٹر ضمیر احسن، اختر عزیز، انتظار غازی پوری، نظام حسن پوری اور تشنہ کانپوری وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ (فیکس سے)

● دارجلنگ۔ 19 جولائی، شعبۂ اردو، دارجلنگ گورنمنٹ کالج، میں ایک سیمینار کا انعقاد ہوا، اس سیمینار کا موضوع ''عالمی رابطہ اور تفہیمیت'' تھا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عمر غزالی نے کہا کہ ''تفہیمیت'' کا لفظ ایک یونانی دیومالائی شخصیت ''ہرمیز'' سے مشتق ہے۔ امریکا میں بھی اس کی طرف توجہ دی گئی لیکن اس پر خاص توجہ ایک فرانسیسی نقاد نے دی۔ تفہیمیت جیسے ادق موضوع پر مبسوط بحث کے لیے محترمہ لنڈا کوہنٹ صاحبہ کو زحمت دی گئی جو ایک بزرگ صحافی ہیں، اور فی الوقت Website Consultant ہیں۔ آپ امریکن ہیں اور پیرس میں سکونت پذیر ہیں۔

سیمینار کا تمہیدی خطبہ ڈاکٹر عمر غزالی نے دیا اور تفہیمیت سے متعلق چند معلوماتی باتیں کہیں۔ محترمہ لنڈا کوائینٹ نے عالمی رابطے پر بہت ہی پرازمعلومات خطبہ دیا اور تفہیمیت کے اصول و نظریات پر بحث کرتے ہوئے پال ریکور، فریڈرک، شیلئر ماخر (بابائے تفہیمیت)، بورنخ، ولیم دلیتھے اور ہنس جارج گیڈلیر وغیرہ کے نظریوں کی وضاحت کی۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا جس میں اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے سوالات کیے اور محترمہ لنڈا نے ان کا جواب دیا۔ اس کے بعد کالج کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر ارشاد غلام احمد نے مذکورہ موضوع پر تبصرہ پیش کیا اور چند نئے نکات کی طرف اشارے کیے۔ سیمینار کی صدارت دارجلنگ گورنمنٹ کالج کی پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر للیتا رائے احمد صاحبہ نے کی، جو نیپالی ادب کی نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں محترمہ لنڈا کی آمد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور آئندہ بھی آنے کی دعوت دی تا کہ اس نوع کے موضوع پر Multi Lingual Approach بھی واضح ہوسکے۔ (ڈاک سے)

● میرٹھ۔ 11 جولائی، شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پانچویں جشن یوم تاسیس کے موقعے پر یونیورسٹی کے رجسٹرار جناب وی.کے.سنہا نے کہا کہ پانچ سالہ قلیل مدت میں ہی شعبے نے جس تیز رفتاری سے ترقی اور شہرت حاصل کی ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے رشید الدین احمد نے کہا کہ میرٹھ شہر اردو کا گہوارہ رہا ہے مگر گذشتہ چند دہائیوں میں یہ پرکشش زبان اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے چھٹپٹا رہی تھی۔ اس شعبے کی کاوشوں کے نتیجے میں اردو یہاں دوبارہ سر اٹھانے لگی ہے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ہم نے اردو کی آبیاری کے لیے بہت کچھ کیا ہے مگر ابھی بھی اردو کو یہاں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں کافی وقت لگے گا اور اس کے لیے نہ صرف شعبۂ اردو بلکہ اس زبان سے محبت رکھنے والے تمام شہریوں کو مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی۔

اس موقعے پر نذیر میرٹھی کے پہلے شعری مجموعے ''اعتراف'' کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔ میرٹھ کالج میرٹھ کے صدر شعبہ ڈاکٹر خالد حسین نے کہا کہ ان کی شاعری زندگی کی سچائیوں کی ترجمان ہے۔ زبان عام فہم، سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ مسعود اختر نے نذیر میرٹھی کا قلمی خاکہ پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● سیتاپور۔ معروف ادبی تنظیم ''بزم اردو سیتاپور'' کے زیر اہتمام مقامی ابوالحسن علی ندویؒ اکیڈمی میں ایک مذاکرہ ہوا جس کا موضوع تھا ''آج کے عہد میں اردو زبان و ادب کی اہمیت'' تقریب کی صدارت جناب ثبت حفیظ رحمانی نے کی جبکہ نظامت کی ذمے داری بزم اردو کے سکریٹری جناب رضوان خاں نے نبھائی۔ پروگرام کے آغاز میں رضوان خاں نے کہا کہ اردو زبان و ادب نے ہر شعبے کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ سماج کا ہر طبقہ زبان اردو کا دلدادہ ہے۔ اردو ادب نے مختلف طبقوں کی زندگی کا عکس پیش کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو ادب دیگر اہم زبانوں کے ادب کا ہم پلہ ہے۔ صدر تقریب جناب مست حفیظ رحمانی نے کہا کہ اردو زبان کی شیرینی اور اردو ادب کی قدر و قیمت کا اعتراف انھیں بھی ہے جو اس جہانگیر زبان کے مخالفین ہیں۔ اشتیاق علی صبا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو وہ خوبصورت زبان ہے جو لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ جناب سلیم اختر نے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیا۔ بابو صادق علی نے اردو تحریک کو مزید فعال بنائے جانے کے لیے مختلف تنظیموں کے درمیان Co-ordinations قائم کرنے پر زور دیا۔ عمران سیتاپوری، ابوالمجاہد اور عارف محمد عارف نے بھی مذاکرے میں حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

• سرینگر۔ سمنانیہ کلچرل آرگنائزیشن کلگام اور کلچرل اکادمی کی طرف سے ڈگری کالج کلگام میں علاقے کے ایک معروف شاعر اور قلم کار مرحوم حمید اللہ خاکسار کی پانچویں برسی پر ایک ادبی تقریب منعقد کی گئی جس میں مرحوم شاعر کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ تقریب پر سی پی آئی ایم کے ریاستی سکریٹری اور ایم ایل اے کلگام محمد یوسف تاریگامی مہمانِ خصوصی تھے۔ جنھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایسی ادبی محفلیں منعقد کرنے سے جہاں شعرا اور فنکاروں کو اپنی ادبی تخلیقات پیش کرنے کا موقع ملتا ہے وہیں سامعین بھی ان تخلیقات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ انھوں نے سمنانیہ کلچرل آرگنائزیشن کلگام کو ضلع کے مختلف علاقوں میں ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کرنے کا مشورہ دیا۔ تاریگامی نے اس ادبی انجمن کو ہر ممکن امداد کی یقین دہانی کروائی۔ اس تقریب میں ایک محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں ضلع بھر سے آئے ہوئے شعرا حضرات نے اپنا اپنا کلام پیش کیا جن میں ناجی منور، ایوب صابر، کتب الدین شکیل، بشیر زائر، سیف احمد میر، یوسف گلشن، نثار راہی، جہانگیر احمد جہانگیر، غلام نبی ناظر، مشتاق ترکی، رئیس خان نثار، علی الیاس، مشتاق غمگین، شید افیاض، تنہا اشمی اور گلزار احمد شبنم شامل تھے۔ اس موقع پر نوجوان شاعر سیف احمد میر کے کشمیری شاعری کے مجموعے ''سنے'' کی رسم رونمائی کی گئی۔ کتاب پر ناظر کلگامی نے اپنا مقالہ پڑھا۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

• کانپور۔ 7 اگست، صدیق فیض عام انٹر کالج ہال میں ملک کے نامور شاعر کوثر جائسی مرحوم کی دوسری برسی کے موقع پر ایک مشاعرہ بیاد کوثر کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت الحاج ناظر صدیقی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض حنیف صابری نے انجام دیے۔ مشاعرے کا آغاز طاہر قادری کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ بعدہٗ دوم کوثر جائسی کی نعت پاک حافظ ظہیر کانپوری نے پیش کی۔ طاہر قادری نے ''نقوش عہد گذشتہ'' اپنی نظم بطور نذرانۂ عقیدت بیاد کوثر جائسی پیش کی۔ مشاعرے میں بڑی تعداد میں شہر کے عمائدین، معززین نے شرکت کی۔ ادارہ القاضی کانپور کے صدر قاضی محمد جنید، خورشید الرحمٰن حنفی جنرل سکریٹری و نائب سکریٹری دکنوینر مشاعرہ طاہر قادری نے گلپوشی کی اور درج ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ الحاج ناظر صدیقی، الحاج محمد قاسم حبیبی برکاتی، الحاج ابوالحسنات حنفی، زبیر شفائی، مصطفےٰ فراز، فاروق جائسی، شمیم لہٰ آبادی، اسلم محمود، ظفر لہٰ آبادی، پرویز ادیب، حنیف صابری، عرفان عجمی، الحاج میکائل ضیائی، طاہر قادری کانپوری، ڈاکٹر قسیم جعفری، معروف کائناتی، جمیل صدیقی، محور ادیبی، جاوید گونڈوی، اعجاز صدیقی، قسیم اشرفی، گھائل فرخ آبادی، درد چاپدانوی، شاعر فتح پوری، عتیق فتح پوری، اکمل ادیب، مشیر صدیقی، شعور اشرفی، ضمیر جائسی، زبیر فاروقی، سید وسیم الحسن ہاشمی، شعیب نظام، لطافت حسین، محمد مقصود خاں الن، محمد حسیب خاں اچھن وغیرہ۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

• نئی دہلی۔ 27 جولائی، 'بزم صادق' کے زیر اہتمام ہری الکلیو سلطان پوری کے بزرگ شاعر مطرب جارچوی کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سعید الدین قاسمی اور نظامت درد دہلوی نے کی۔ رشید انجان اور ڈاکٹر اے ایچ خان نے شمع روشن کی۔ اس موقع پر مطرب جارچوی کی خدمت میں ایک سپاسنامہ اور شیلڈ پیش کی گئی۔ ان کے علاوہ حاصل سنبھلی، ماسٹر نثار احمد، درد دہلوی کو بھی شیلڈ دی گئی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

• امروہہ۔ 7 اگست، بسلسلۂ ولادت با سعادت حضرت علیؓ ایک محفل مقاصدہ بمقام عزاخانہ سید دوست علی مرحوم محلّہ کشکوئی امروہہ منعقد کی گئی جس کی صدارت عالی جناب مولانا سید محمد سیادت قبلہ امام جمعہ نے فرمائی۔ محفل کا افتتاح مولانا غلام عباس پرنسپل دارالعلوم سید المدارس نے کیا۔ نظامت کے فرائض علی نقوی نے انجام دیے۔ تلاوت کلام پاک صوفی تصدق حسین نے کی جبکہ نعت محمد پرویز عالم نے پڑھی۔ شعرا تھے۔ ولی حیدر ولی، مبارک امروہوی، کمال حیدر کمال، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، اضو حسین تمنا، کیفی سنبھلی، شان حیدر بیباک، بھون امروہوی، مسرور جوہر، ڈاکٹر نسیم الظفر اور شفیع الرحمٰن خاں قیصر امروہوی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

• کولکاتا۔ 21 جولائی، مسلم انسٹی ٹیوٹ اور سہ ماہی ادبی جریدے ''مژگاں'' کے زیر اہتمام نعیم انیس کی مرتبہ کتاب ''اعزاز افضل: فن اور فن کار'' کا اجرا ڈاکٹر شہناز نبی (ریڈر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کے ہاتھوں انجام پایا۔ تقریب کا آغاز اردو یونیورسٹی کے طالب علم طریز احمد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ رسم گل پوشی کے بعد سید علی احمد نے اپنی دل نشیں آواز میں اعزاز افضل کی ایک غزل سے سامعین کو محظوظ کیا۔

استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید نے کہا کہ پروفیسر اعزاز افضل کے انتقال کے بعد نعیم انیس نے ان کے تین نایاب مجموعوں کو یکجا کر کے شائع کیا جو پروفیسر موصوف کے کلام کی بازیافت تھی۔ آج افضل صاحب کے یوم ولادت کے موقع پر ہم سب ان کے فن اور شخصیت پر قلم بند ملک بھر کے مشاہیر قلم کاروں کے مقالوں پر مبنی کتاب ''اعزاز افضل: فن اور فن کار'' کی رسم رونمائی کے لیے موجود ہیں۔ یہ کتاب بھی شاعر کو ایک زبردست خراج عقیدت ہے۔ اس کے

لیے نعیم انیس کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے میں کہنا چاہوں گا کہ افضل صاحب کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہنوز ہماری نگاہوں سے دور ہے۔ ضرورت ہے کہ افضل صاحب کے اس باقی ماندہ کلام کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے۔ بنگال کی شاعری میں افضل صاحب کے مقام کا تعین کرنا ہمارے اوپر ایک قرض تھا، امید ہے کہ مذکورہ کتاب اس قرض کو ادا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

کتاب کے اجرا کے بعد محترمہ شہناز نبی نے کہا کہ افضل صاحب کا شمار نہ صرف اردو کے بہترین مدرس کی حیثیت سے ہوتا تھا، بلکہ اہلِ اردو انھیں اردو کے اچھے عالم کی حیثیت سے بھی جانتے تھے۔ افضل صاحب کی طرح بنگال کے دوسرے دو عظیم شعرا ناسخ اور وحشت پر بھی زیادہ کام نہیں کیا گیا۔ افسوس کا مقام یہ بھی ہے کہ بنگال کے ادبا و شعرا پر کام کرنے کے لیے اگر کوئی بڑھتا ہے تو وہ خود ان کے اہلِ خانہ ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیگر محققین و ناقدین بھی ان پر کام کریں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیکچرر جناب محمد کاظم نے کہا کہ ڈاکٹر محمد حسن نے افضل صاحب کو کلکتے کا چہیتا شاعر کہا ہے مگر یہاں انھوں نے بخالت سے کام لیا ہے کیوں کہ اعزاز افضل صاحب کلکتے کے ہی نہیں پوری اردو دنیا کے چہیتے شاعر تھے۔ جناب کلیم حاذق نے کہا کہ افضل صاحب نہ صرف بڑے شاعر تھے بلکہ بڑے انسان بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے جو سیکھا تھا، اپنی زندگی میں ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

نعیم انیس نے کہا کہ اس کتاب کی تیاری کا کام اعزاز افضل صاحب کی حیات ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ یہ سنہ 2004 کی بات ہے۔ اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین کا وہ خود مطالعہ کر چکے تھے۔ میری خواہش تھی کہ 20 جولائی کو ان کی سالگرہ کے موقع پر یہ کتاب منظرِ عام پر آئے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جناب شمیم انور (صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے کہا کہ افضل صاحب نہ صرف غزل و قطعات کے شاعر تھے، بلکہ آج بھی محرم کی مجالس عزا میں افضل صاحب کے لکھے ماتم اور نوحے بصد احترام و خلوص پڑھے جاتے ہیں۔ جناب منصور احمد ملک نے اپنی صدارتی تقریر میں افضل صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ اخیر میں جناب نوشاد مومن (مدیر، سہ ماہی ''مژگاں'') نے حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کی نظامت کے فرائض جناب شمشیر عالم نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● وارانسی۔ 7 جولائی، بنارس کے نوجوان شاعر کبیر اجمل کے پہلے شعری مجموعے ''منتشر لمحوں کا نور'' کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام شہر کی ایک تنظیم ''دبستان ادب'' نے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر حنیف احمد نقوی نے فرمائی۔ آپ کی ذات گرامی تعارف کی محتاج نہیں۔ مہمان خصوصی جناب شمیم طارق تھے جو ممبئی سے بطور خاص پروگرام میں شرکت کے لیے بنارس آئے تھے۔ انھوں نے کبیر اجمل کی شاعری کو نئی نسل کی نمائندہ شاعری قرار دیا۔ وسنت کالج بنارس میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر یعقوب یاور نے کبیر اجمل کو اس بات کے لیے بطور خاص سراہا کہ ان کی شاعری میں سنی سنائی باتوں کے بجائے ذاتی تجربات و مشاہدات کی واضح بازگشت ہے۔ معروف شاعر باذل عباسی نے کبیر اجمل کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی انوکھی لفظیات، نیز تلمیح و استعارہ میں ان کی جدت طرازیوں پر سیر حاصل بحث کی۔ آخر میں پروفیسر حنیف احمد نقوی نے کہا کہ میں کبیر اجمل کو جانتا تو بہت پہلے سے تھا لیکن ان کا کلام دیکھ کر چونک پڑا۔ انھوں نے کہا کہ کبیر اجمل کی شاعری بنارس میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

اس ادبی محفل کے دوسرے حصے میں مشاعرے کا اہتمام تھا جس میں تقریباً پچیس شعرا نے اپنے منتخب کلام سے حاضرین بزم کو محظوظ کیا۔

(ڈاک سے)

● بھیونڈی۔ 3 جولائی، رئیس ہائی اسکول و جونیئر کالج کے زیر اہتمام غلام محمد کالج آڈیٹوریم میں رئیس کالج کے استاد جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کی کتاب ''معارف کیمیا'' کا اجرا کرتے ہوئے کے.ایم.ای.سوسائٹی کے صدر جناب اسلم فقیہ صاحب نے کہا کہ اساتذہ تصنیف و تالیف کے ذریعے علم کی ترویج و اشاعت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ہماری زبان میں سائنسی و تکنیکی علوم کی کتابوں کی آج بھی کمی ہے۔ جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نے بارھویں کے نئے نصاب کی روشنی میں ''معارف کیمیا'' کی تصنیف کے ذریعے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔ جناب بلال احمد مومن، ہیڈ ماسٹر، صمدیہ ہائی اسکول و جونیئر کالج، نے 'معارف کیمیا' کو علمِ کیمیا کی ایک ایسی تدریسی کتاب سے تعبیر کیا جو ہر لحاظ سے معتبر اور معیاری ہے۔ رئیس ہائی اسکول کمیٹی کے چیئرمین جناب شفیع مقری نے صاحب کتاب جناب ضیاء الرحمٰن انصاری کی دردمندی، جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم کا ذکر کرتے ہوئے اساتذہ سے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی۔ پرنسپل غلام محمد کالج محترمہ کملا بالاسبرمنین، تقریب کے خصوصی مہمان ڈاکٹر مصدق پٹیل، رئیس جونیئر کالج کے چیئرمین جناب دانیال قاضی اور صلاح الدین ایوبی کالج کی سربراہ محترمہ عطیہ خان نے بھی صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔

رئیس کالج کے استاد جناب رفیع انصاری نے استقبالیہ تقریر پیش کی۔ ہیڈ ماسٹر رئیس ہائی اسکول و جونیئر کالج جناب فیضان احمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کی خدمات میں گلہائے عقیدت پیش کیے اور جناب عامر صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

سید فرید احمد برکاتی

● جے پور۔ یکم جولائی 2007 کی صبح ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی وفات پاگئے۔ ان کی عمر 64 سال تھی، عرصے سے امراضِ قلب میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، تین صاحبزادگان، تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم.اے. عربی میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے کے بعد راجستھان یونیورسٹی سے اردو میں ایم.اے. اور پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری حاصل کی اور اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے بحیثیت استاد منسلک ہوگئے۔ 1988 میں ان کا پی.ایچ.ڈی. کا مقالہ ''فرہنگ کلیاتِ میر'' کے نام سے شائع ہوا جس نے علمی و ادبی حلقوں میں شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ان کے تحقیقی مضامین ہند و پاک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

مرحوم کو عربی، فارسی اور اردو فرہنگ ولغات پر عبور حاصل تھا اور لسانیات پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنے کئی شاگردوں سے فرہنگ ولغات پر تحقیقی کام کروائے ہیں جس میں خصوصیت سے قابلِ ذکر اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ، کلیاتِ سودا کی تقابلی فرہنگ، کلیاتِ میر حسن کی فرہنگ، فرہنگِ نو آئینِ ہند، قرآن مجید کے اولین دو تراجم کا تاریخی ولسانی جائزہ وغیرہ شامل ہیں۔ مرحوم کے والد شفاء الملک مولانا سید ظہیر احمد برکاتی ایک حاذق طبیب اور نواب صاحب ریاست ٹونک کے معالج خصوصی تھی۔

فرید صاحب کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک میں ہوئی، اس زمانے کے جید علما اور حفاظ سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔ گھر کے دینی ماحول کا آپ کی شخصیت پر بہت گہرا اثر تھا۔ آپ کا انتقال علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

شاہد احمد خان

● کولکاتا۔ 29 جولائی، معروف صحافی اور پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے ریجنل منیجر (مشرق) شاہد احمد خاں کا طویل علالت کے بعد یہاں ایک نرسنگ ہوم میں انتقال ہوگیا۔ وہ 48 برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی اور دو بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کو سرکینسر کا عارضہ لاحق تھا۔ حالت زیادہ بگڑنے پر انھیں مصنوعی آلۂ تنفس پر رکھا گیا تھا۔ شاہد احمد خاں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز مشرقی ہند کے موقر اردو روزنامے ''آزاد ہند'' سے 1980 میں کیا تھا۔ دو سال بعد انھوں نے خبر رساں ایجنسی PTI جوائن کرلی جہاں کے نظام میں مسلسل ترقی کرتے ہوئے 1977 میں وہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں پی ٹی آئی کے نامہ نگار مقرر کیے گئے۔ پاکستان میں 1977 سے 2000 تک اپنی تعیناتی کے دوران شاہد احمد خاں نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کی صحافتی کوشش کو ذہن میں رکھ کر بڑی ذمے دارانہ خبرنگاری کی۔ وطن واپسی کے بعد انھیں کولکاتا میں پی ٹی آئی کا علاقائی جنرل منیجر بنایا گیا تھا۔

احمد علی خاں ساگر

● رام پور۔ 6 اگست، رام پور کے سینئر صحافی احمد علی خاں ساگر کا آج صبح حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ انھیں مٹھ والا قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ مرحوم احمد علی خاں ساگر نے اپنی صحافت کی ابتدا 1952 سے ماہ نامہ ''ترانہ'' شائع کرکے کی تھی۔ پھر انھوں نے 1962 میں ہفت روزہ ''قومی ترانہ'' کے نام سے اخبار شائع کیا جو آخر تک جاری رہا۔ ساگر کا شمار رام پور کے ایماندار صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ آخری سانس تک اردو کی خدمت کرتے رہے۔

پاگل عادل آبادی

● عادل آباد۔ 4 اگست، ممتاز مزاحیہ شاعر پاگل عادل آبادی کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ وہ 66 برس کے تھے اور طویل عرصے سے علیل تھے۔ سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں عیدگاہ قبرستان میں تدفین عمل میں لائی گئی۔ انتقال کی اطلاع کے ساتھ ہی سینکڑوں افراد بشمول سیاسی قائدین، اساتذہ، شعرا، صحافی، ڈاکٹرز، وکلا اور طلبہ نے مرحوم کے مکان ''اردو محل'' پہنچ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور پسماندگان سے تعزیت کا اظہار کیا۔ ان کا اصل نام احمد شریف تھا اور وہ 37 برس تک پیشۂ تدریس سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنی طنز ومزاح سے بھرپور شاعری کے ذریعے ملک و بیرون ملک کافی مقبولیت حاصل کی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 5 لڑکے اور ایک لڑکی شامل ہے۔

جلیل ساز

● ناگپور۔ اردو کے مشہور شاعر اور ناگپور میونسپل کارپوریشن کے سابق کارپوریٹر 76 سالہ جلیل ساز گذشتہ شب دورۂ قلب کے سبب یہاں رحلت کر گئے۔ عبدالجلیل ساز 2 فروری 1931 کو ناگپور میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ان کے

اجداد کا تعلق مبارک پور مئو (یوپی) سے تھا۔ انھیں شعروادب ورثے میں ملا تھا۔ ان کے ایک بزرگ صوفی عبدالصمد اختر تھے جو مولانا ناطق گلاؤٹھی کے شاگرد تھے جبکہ جلیل ساز کو طرفہ قریشی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

جلیل ساز نے 1969 میں ناگ پور بلدیہ کا الیکشن لڑا اور بہت نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنے سیاسی عروج کے زمانے (1972) میں ڈاکٹر ذاکر حسین ڈی ایڈ کالج کی بنیاد ڈالی وہ مجیدیہ گرلس ہائی اسکول و جونیئر کالج کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے ناگ پور سے ایک پندرہ روزہ اخبار، ''مشعلِ حیات'' بھی نکالا تھا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''نگاہ'' گذشتہ برس شائع ہو چکا ہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں 6 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ آج بعد نماز ظہر مومن پورہ مسلم قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا اس موقع پر سوگواروں کی خاصی تعداد تھی جن میں ناگپور کے بیشتر اہل ادب شامل تھے۔

رشید سلونی

● ممبئی۔ اردو کے بزرگ شاعر 94 سالہ رشید سلونی کا 16 جولائی 2007 کو انتقال ہوگیا۔ رائے بریلی (یوپی) سے قریب مردم خیز خطے سلون سے ان کا تعلق تھا۔ مرحوم پی.ای.ایس.ٹی. کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد صرف شعروادب کے ہی ہوکر رہ گئے۔ کبھی نام ونمود یا شہرت کی طلب ان کے یہاں نہیں دیکھی گئی وہ کسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو وودھ بھارتی کے کئی پروگراموں کے اسکرپٹ انھوں نے لکھے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''شام ڈھلے'' فروری 1999 میں شائع ہوا تھا۔ وہ اپنا کلیات شائع کروانا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ مرحوم بڑے خوش مزاج، ملنسار، مخلص اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔

□□□

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو ادب کے ایک ایسے عظیم فکشن نگار ہیں جن کا سرمایۂ فکر وفن اعتبار واستناد کا درجہ رکھتا ہے۔
اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کی زندگی، ان کے تصورِ حیات، ان کی تخلیقات اور ان کے عہد کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت -/152 روپے

دیوانِ درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس طاقتور روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کررہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت -/160 روپے

تبصرہ وتعارف

● کلیات پریم چند (جلد 17)
مرتب: مدن گوپال
صفحات: 645، قیمت: -/208 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: ارتضیٰ کریم، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

پریم چند شناسی میں مدن گوپال کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں پریم چند کی حیات اور تخلیقات سے خاص شغف ہے۔ مقام مسرت ہے کہ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی دعوت پر، پریم چند کی تخلیقات کو صحت متن کے ساتھ ازسرنو مرتب کرنے کا عزم کیا۔ کلیات پریم چند کی زیرنظر جلد اسی سلسلے کی سترھویں کڑی ہے۔ ڈائرکٹر قومی کونسل کے الفاظ میں: قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو کلیات پریم چند کے عنوان سے 24 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں۔ یہ کافی اہم کام ہے، جو اب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ سترھویں جلد جو پریم چند کے خطوط پر مشتمل ہے، اب سے دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سات جلدیں اور شائع ہوگئی ہیں۔

زیرتبصرہ جلد میں پریم چند کے 690 خطوط شامل ہیں۔ خطوط کا مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اس لیے کہ اولاً تو اس کا ضابطہ بنانا ہی مشکل امر ہوتا ہے۔ یعنی خطوط کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا جائے یا بہ لحاظ مکتوب الیہ۔ زمانی ترتیب سے مرتب کرنے میں ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ خط کے متن میں تسلسل کی کمی ہوتی ہے، نیز بیچ بیچ میں دیگر خطوط کے آجانے سے لب ولہجہ اور اسلوب میں یکسانیت نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں قاری کو خطوط کے اصل تناظر تک پہنچنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ اگر چہ اس کتاب میں خطوط کی ترتیب میں نہایت عرق ریزی اور محنت سے کام لیا گیا ہے تاہم کچھ خامیاں راہ پاگئی ہیں۔ مثلاً خط نمبر 15 جو بنام دیانرائن نگم ہے، اسے 14 نمبر پر شامل ہونا چاہیے تھا۔ بعد میں یہی خط یعنی خط نمبر 15 صفحہ نمبر 344 پر 391 نمبر پر شامل ہے۔ وہاں تاریخ کے تعین میں تسامح تھا مگر یہاں دسمبر 1929 درج ہے۔ ایک اور کمی جس کا احساس بار بار ہوتا ہے اور جسے متنی تنقید کی رو سے عیب تصور کیا جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مکتوب الیہم کے نام خطوط کی تعداد درج نہیں ہے۔ مختلف حضرات کے نام لکھے گئے خطوط کی تعداد کا ذکر مرتب کو کرنا چاہیے تھا اور کون سا خط کس صفحے پر ہے اس کی تفصیل بھی آنی چاہیے تھی تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہوسکے۔ کتاب میں سب سے زیادہ خطوط دیانرائن نگم کے نام ہیں۔ تقریباً 310 یا 315 کے دستیاب خطوط میں سب سے بڑی تعداد ان خطوط کی ہے جو انھوں نے دیانرائن نگم کو لکھے تھے۔ اس روشنی میں پریم چند اور دیانرائن نگم کے تعلقات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ان خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ پریم چند شخصیت کے اعتبار سے اسلوب اپناتے تھے۔ یعنی جب مہتاب رائے، دیانرائن نگم اور امتیاز علی تاج وغیرہ کو خط لکھتے ہیں وہاں اردو کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے مگر جب یہی پریم چند شیو پوجن سہائے، آنند راؤ جوشی، ولارے لال بھارگو، پرواسی لال ورما، دشرتھ لال، سوریہ کانت، جینندر کمار، اوشادیوی اور شیورانی دیوی وغیرہ کو خط لکھتے ہیں تو بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ ان خطوط کے ہندی الفاظ سے گزرتے ہوئے کہیں کہیں یہ سوال سراٹھاتا ہے کہ کیا پریم چند کے زمانے میں ایسی ہندی کا رواج تھا؟

پریم چند کے یہ خطوط اپنے متن میں اپنا عہد بھی سمیٹے ہوئے ہیں اور ان سے پریم چند کے ادبی اور فکری رویوں تک بھی رسائی ہوتی ہے نیز یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ انھیں سماج اور ملک وقوم کی کتنی فکر رہتی تھی اس سے ان کی زندگی کے نشیب وفراز سے بھی ہم واقف ہوتے ہیں۔ مدن گوپال اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا شکریہ اردو برادری پر واجب اور ضروری ہوجاتا ہے کہ ان کے ذریعے اردو کا اہم کلاسیکی سرمایہ اردو قارئین تک پہنچا ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب پریم چند شناسی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

● آئینۂ جہاں۔ کلیات قرۃ العین حیدر۔ (جلد چہارم)
مرتب: جمیل اختر
صفحات: 378، قیمت: -/210 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: محمد عمر رضا، 224 ای، مہاندی ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے اردو فکشن میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ ہندوستان کے اہم اور باوقار ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ'' سے سرفراز اس فکشن نگار کا قلم آج بھی جادو بکھیر رہا ہے۔ ان

کے افسانوں اور ناولوں میں ہمیں زندگی کے مختلف شیڈ نظر آتے ہیں۔ عام طور پر انھوں نے اونچے اور متوسط طبقے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور اس پس منظر میں ہندوستانی معاشرے کے مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کی سماجی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ وقت جس طرح کی قلابازیاں کھاتا رہتا ہے، اس کی وہ بہت ہی حسین تفسیر بیان کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں تہذیبیں کس طرح ایک قوم سے دوسری قوموں میں داخل ہوتی ہیں، اس کی طرف انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں بہت ہی گہرے اشارے کیے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے ایک منضبط منصوبے کے تحت قرۃ العین حیدر کی تمام تخلیقات کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں شائع کر رہی ہے اور اب تک کلیات کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ان کے وہ افسانے جو کسی نہ کسی مجموعے میں شامل ہیں کلیات کی ابتدائی دو جلدوں میں شامل کر لیے گئے ہیں، لیکن ڈاکٹر جمیل اختر کو دوران تحقیق قرۃ العین حیدر کے ایسے افسانے بھی دستیاب ہوئے جو اب تک کتابی صورت میں شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔ لہٰذا ان افسانوں کو انھوں نے زیر تبصرہ کلیات قرۃ العین حیدر کی چوتھی جلد بعنوان ''قندیل چین'' میں شامل کر دیا ہے۔

زیر تبصرہ جلد میں کل اکیس افسانے شامل ہیں۔ اس میں شامل پہلا افسانہ بعنوان ''ایک شام'' قرۃ العین حیدر کا اولین افسانہ ہے جسے انھوں نے ''لالہ رخ'' کے فرضی نام سے چھپوایا تھا۔ یہ افسانہ نومبر 1934 میں ''ادیب'' میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں قرۃ العین حیدر کی عمر تقریباً سترہ سال کی تھی۔ علاوہ ازیں ''ارادے'' (ادیب، جون 1944)، ''دریچے کے سامنے'' (ساقی، جولائی 1944)، ''خوابوں کے محل'' (ادب لطیف، ستمبر 1944)، ''دھندلکوں کے پیچھے'' (ساقی، جنوری 1945)، ''میری گلی میں ایک پردیسی'' (عالم گیر۔ خاص نمبر، لاہور، جنوری، فروری 1945)، ''زندگی کا سفر'' (شاعر۔ افسانہ نمبر، آگرہ، اکتوبر، نومبر 1945)، ''دوسرا کنارہ'' (آج کل، جون 1947)، ''شیشے کے گھر جو ٹوٹ گئے'' (ساقی، اکتوبر 1948)، ''پچھلے برسوں کی برف'' (ساقی، نومبر 1948)، ''وہی زمانہ وہی افسانہ'' (نقوش، مئی 1925)، ''رام یہ کیسا گورکھ دھندا ہے'' (ادب لطیف، مارچ 1955)، ''دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار'' (نقوش، 1962)، ''میں بوری ڈوبت ڈری!'' (نقوش، 1964)، ''آوازیں'' (نقوش، 1964)، ''شربت والی گلی'' (شمع، جنوری 1966)، ''تار پر چلنے والی'' (شمع، نومبر 1966)، ''سنگھاردان'' (بیسویں صدی، 1966)، ''ایک پرانی کہانی'' (نیا دور، کراچی)، ''بڑے آدمی'' (نقوش، 1967) اور ''آخر شب کے ہم سفر'' (روبی، جولائی 1971) اس کلیات میں شامل ہیں۔

عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان میں جس دو رنگی معاشرت کی تخلیق ہوئی، قرۃ العین حیدر اسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ جس طرح کے نشیب و فراز سے دو چار رہیں، ان سب کی جھلکیاں مذکورہ افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ بیشتر افسانے پچھلی نصف صدی کے تغیر پذیر معاشرے کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ مختلف لسانی اور تہذیبی اختلافات کے باوجود ہندوستان میں جس نوع کی تہذیبی وحدت پائی جاتی ہے، اس کی بھی عکاسی ان افسانوں میں ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانے عینی کی زندگی کا آئینہ ہیں جن میں قارئین کو اس عہد کی پوری تصویر نظر آئے گی جس میں ہندوستانی معاشرت نے ایک نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ عینی کا مزاج بے حد شاعرانہ، آرٹسٹک اور فلسفیانہ ہے۔ انھوں نے اپنے ان افسانوں میں زندگی کے مختلف رازوں کو بڑے فلسفیانہ انداز میں منکشف کیا ہے۔ مثلاً ''دریچے کے سامنے'' میں انھوں نے معاشرے کے مختلف اقسام کے لوگوں کا بڑا ہی موثر نقشہ کھینچا ہے۔ عینی دریچے کے پاس جاتی ہیں اور سڑک سے گزرنے والے قسم قسم کے لوگوں کا بڑے بے باکانہ انداز میں تجزیہ کرتی چلی جاتی ہیں جس سے نہ صرف یہ کہ انسانی نفسیات کی مختلف تہیں نمودار ہوتی ہیں بلکہ عینی کی ذہانت اور فنکاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس افسانے کے اخیر میں معاشرے کی ایک تصویر انھوں نے کچھ یوں پیش کی ہے:

''رات کے سناٹے میں جب سڑک کا سارا شور و شغب ختم ہو چکا ہوتا ہے تو آس پاس کی کوٹھیوں کے نوکر بیڑیاں پیتے اور ''میرے لیے تو موت کا ہائے بہانہ ہو گیا'' یا ''گھر لے لیا ہے ہم نے ترے گھر کے سامنے'' الاپتے ہوئے اپنی تفریح کے مقاموں کی طرف جاتے ہیں اور سب سے آخر میں کوئی بھولا بھٹکا مسلمان کھڑاؤں پہنے نہایت صاف اور پُر درد آواز میں قرآن کی کوئی سورت قرأت سے پڑھتا ہوا شاید نماز عشا کے لیے طبیہ کالج کی مسجد کی طرف جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ کی آواز رات کے اندھیرے کی خاموش گہرائیوں میں کھو جاتی ہے۔

زندگی کے اس درماندہ اور بے لطف ڈرامے کے لیے یہ آواز کس قدر عمدہ Epilogue ہے!!!'' (ص 111,110)

کلیات میں شامل افسانوں کے مطالعے سے یوں تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں جو تکنیک اختیار کی ہے، وہ بالکل ہی منفرد اور کسی بھی ازم سے مبرا ہے۔ ان افسانوں میں استعمال کی گئی تکنیک پر انھوں نے کلیات میں شامل اپنے تفصیلی دیباچے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''اس مجموعے کے سارے افسانے پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ میں نے انھیں پہلے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس میں پہلا افسانہ جو 1943 میں شائع ہوا تھا بہ عنوان ''ایک شام'' اس وقت سے لے کر

آج تک کا افسانوی سفر بہت طویل ہے۔ اس دوران میں ترقی پسند، جدیدیت، تجریدیت، وغیرہ وغیرہ کی دھوم میں مچیں لیکن یہ بندی اس ساری دھوم دھام سے بے نیاز اپنی ڈگر پر چلا کی۔ مجھے افسانوں کے تکنیکی رموز و نکات نہ اس وقت سمجھ میں آتے تھے اور نہ آج میرے پلے پڑتے ہیں۔'' (ص-29)

''اور پھر بیاں اپنا'' میں فاضل مرتب نے اپنے سفر پاکستان کا دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور کلیات میں شامل افسانوں کو یکجا کرنے میں انھیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کا بھی انھوں نے تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ کلیات میں شامل افسانے قرۃ العین حیدر کے فکر وفن کا صحیح اور مناسب جائزہ لینے میں بے حد مددگار ثابت ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر پر تحقیق کرنے والے نہ صرف یہ کہ طلبہ اور اساتذہ بلکہ دیگر اہل نظر حضرات کے لیے بھی یہ کلیات بے حد مفید مطلب ہے۔

● آزادی کی نظمیں

مرتب: سبط حسن

صفحات: 143، قیمت:-/80 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: عبدالرب، 265، سابر حتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 110067

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ملک میں 150 ویں سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی جارہی ہے۔ اردو کے تقریباً تمام اہم ادارے نہ صرف سیمینار اور سمپوزیم کا انعقاد کررہے ہیں بلکہ ہندوستان کی اس پہلی جنگ آزادی سے متعلق لٹریچر کی اشاعت میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ''آزادی کی نظمیں'' کا قومی کونسل سے شائع ہونا بھی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ادارہ ''نیا ادب'' کی طرف سے شائع ہوئی تھی اور انگریزی حکومت نے اسے فوراً ضبط کرلیا تھا۔ دوسری مرتبہ اس کتاب کو اترپردیش اردو اکادمی نے شائع کیا۔ اترپردیش اردو اکادمی کا ایڈیشن 1985 میں شائع ہوا تھا اور اب یہ ایڈیشن بھی ایک مدت سے ناپید ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔

''آزادی کی نظمیں'' سبط حسن نے مرتب کی ہیں اور کتاب پر مقدمہ رفیع احمد قدوائی کا ہے جو مختصر ہے لیکن اس کی جامعیت میں کلام نہیں۔ قدوائی صاحب نے آزادی کی قدر و قیمت پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس مقدمے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں انگریزی حکومت کے جبر اور اس سے پیدا ہونے والے احساس زیاں کا قارئین کو شدت سے احساس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان نظموں کو یکجا کردیا گیا ہے جن میں اردو شاعروں نے 1857 کے خونریز واقعات پر اپنے ردِعمل کا اظہار کیا ہے چنانچہ یہ مجموعہ عام نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ ہندوستان کی ذہنی بیداری کا اشاریہ بھی ہے۔ اس کتاب کی پہلی نظم مرزا اسد اللہ خاں غالب کی ہے جو بے حد مشہور بھی ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

غالب کے بعد محمد حسین آزاد کی مثنوی 'حب وطن'، خواجہ الطاف حسین حالی کی تین نظمیں بہ عنوان ''آزادی کی قدر''، ''انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی'' اور ''سیاست'' مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی دو نظمیں ''آزادی غنیمت ہے'' اور ''اچھا زمانہ آنے والا ہے''، شبلی نعمانی کی تین نظمیں اور سرور جہاں آبادی کی نظم ''گلزار وطن'' شامل ہے۔ یہ اردو شاعروں میں قدیم وضع کے بزرگ ہیں جو بالعموم ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو ایک طرح کی نعمت تصور کرتے تھے لیکن 1857 کے خونریز واقعات نے ان بزرگوں کو بھی اپنے رویے پر ازسرنو غور کرنے کے لیے مجبور کردیا۔ ان کے بعد علامہ اقبال، ظفر علی خاں، چکبست، حسرت، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، افسر میرٹھی، اختر شیرانی، ساغر نظامی، احمق پھپھوندوی، روش صدیقی، وقار انبالوی، احسان دانش، جمیل مظہری، الطاف مشہدی، فیض احمد فیض، رئیس عظیم آبادی، جذبی، مخدوم، عمر انصاری، شمیم کرہانی، مجاز، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، رضا نقوی، احتشام حسین، سلام مچھلی شہری اور علی سردار جعفری کی نظمیں شامل ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہ بیک وقت انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستانیوں کی انگریزی حکومت سے بیزاری کا بھرپور اظہار ہے۔

اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا حسن و عشق کے ترانوں میں کھوئے ہوئے اور آس پاس کی زندگی سے بالکل ناواقف اس قدر نہیں تھے جیسا کہ اکثر انھیں بتایا گیا ہے بلکہ ان کی شاعری میں بیشتر قومی اور ملی سانحات کا اظہار مسلسل ہوا ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اہم رول ادا کرنے والی ان نظموں کی پذیرائی نہ صرف کل تھی بلکہ اس کی اہمیت وافادیت دوامی حیثیت رکھتی ہے۔

● بہادر شاہ ظفر

مصنف: ڈاکٹر اسلم پرویز

صفحات: 405، قیمت:-/70 روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند)، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

مبصر: ڈاکٹر ابرار رحمانی، تزئین اپارٹمنٹ، 179/22، ذاکر نگر، نئی دہلی-25

1857 کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے آغاز پر ابھی ایک کتاب آئی ہے، ولیم ڈیل رمپل (William Dalrimple) کی The Last Mughal, The fall of a dynasty, Delhi, 1857 لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کی

تیاری میں ڈاکٹر اسلم پرویز کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر'' سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈیل رمپل کی کتاب کا تو خوب شہرہ ہے لیکن ڈاکٹر اسلم پرویز کی کتاب کا کوئی ذکر نہیں، جب کہ اولیت اسلم صاحب کی کتاب کو حاصل ہے۔ یہ انگریزی زبان سے ہماری مرعوبیت کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈیل رمپل نے بھی وہی نتیجہ نکالا ہے، جو ڈاکٹر اسلم پرویز نے اخذ کیا تھا یعنی 1857 کا ابال (Uprising) صرف عوامی شورش یا فوجی بغاوت نہیں بلکہ منظم جہاد تھا جس کا مرکز دہلی تھا۔ اس کی قیادت علمائے دین اور سرپرستی بہادر شاہ ظفر کر رہے تھے۔ اس میں سماج کا ہر طبقہ شامل تھا۔ پوری انیسویں صدی میں مغربی سامراج کو دنیا میں جہاں کہیں بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اس میں سب سے سنگین اور سنجیدہ مزاحمت ہندوستان کی 1857 کی جنگ آزادی تھی۔ تھوڑے اختلاف کے ساتھ مذکورہ باتوں سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر اگر ایک طرف شاعر تھے تو دوسری طرف ان کی حیثیت شہنشاہ دہلی کی بھی تھی۔ زمانے نے انھیں ایک کمزور اور مجبور شہنشاہ کی حیثیت سے تو شہرت دی مگر بحیثیت شاعر انھیں گمنام کرنے کی ناکام کوشش بھی کی۔

اپنی زندگی میں اگر وہ شہنشاہ کی حیثیت میں انگریزوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار رہے تو مرنے کے بعد ان کی شاعرانہ صلاحیت پر شک کیا جانے لگا۔ بعض نقادوں نے بزور قلم انھیں قصر شاعری سے باہر نکالنے کے جتن کیے۔

بہادر شاہ ظفر شہنشاہ بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان پر بادشاہ کی حیثیت سے بھی بہت لکھا گیا ہے اور شاعر کی حیثیت سے بھی بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اسلم پرویز کی کتاب ''بہادر شاہ ظفر'' پہلی مکمل اور جامع تصنیف ہے، جس میں مصنف نے ظفر کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس کی تیاری میں ہر ممکن ماخذ تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ بعض ماخذ سے پہلی دفعہ استفادہ کیا گیا ہے لیکن کتاب کے پہلے حصے کی تیاری میں نیشنل آرکائیوز کی سرکاری دستاویزوں (جو ظاہر ہے برٹش حکومت کی تیار کردہ ہیں) پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کیا گیا ہے، جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کہیں کہیں اس سے مصنف غلط فہمی میں بھی پڑے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے متعلقین کو قید کر کے رنگون بھیجے جانے کے واقعے کی تفصیل اس کتاب کے صفحہ 140 پر اس طرح دی گئی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''19 نومبر 1858 کو طلوع آفتاب کے وقت سیاسی قیدیوں کا قافلہ الٰہ آباد سے مرزا پور پہنچ گیا۔ مرزا پور سے ہگلی کے راستے اگلے سفر کی تیاری کی گئی۔ ایک فوجی کشتی میں، جس کا نام سور مافلیٹ تھا' قیدیوں کو سوار کر دیا گیا اور اس کشتی کو ایک فوجی اسٹیمر سے جوڑ دیا گیا۔ اس اسٹیمر کا نام تھا ٹیمز۔ یہ اسٹیمر اسی روز یعنی 19 نومبر 1858 کو دوپہر دو بجے دریائے ہگلی کے راستے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گیا اور اگلے روز یعنی 20 نومبر کو کلکتہ پہنچ گیا۔ کلکتہ سے روانہ ہو کر یہ اسٹیمر 22 نومبر کو بکسر' 23 نومبر کو دینا پور، 25 نومبر کو مونگیر، 27 نومبر کو راج محل، 28 نومبر کو رام پور بلیا، 29 نومبر کو دمودر گلی، یکم دسمبر کو کھلنا اور 4 دسمبر کی صبح نو بجے ڈائمنڈ ہاربر پہنچ گیا۔ ڈائمنڈ ہاربر پر قیدیوں کو کشتی سے اتار کر انھیں انگریزی جنگی جہاز میگوائر میں سوار کر دیا گیا۔ 4 دسمبر ہی کو ساڑھے گیارہ بجے دن کو یہ جہاز ڈائمنڈ ہاربر سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو کیڈگری پہنچ گیا، جہاں سے دوسرے روز یعنی 9 دسمبر 1858 کو جا کر یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور سیاسی قیدیوں کو رنگون میں اتار لیا گیا۔''

مندرجہ بالا پورا اقتباس غلط اطلاعات پر مبنی معلوم ہوتا ہے:

(1) اگر مرزا پور سے بکسر جانا ہی مقصود تھا تو اس کے لیے پورا صوبۂ بہار پار کر کے کلکتہ (فاصلہ مرزا پور سے کم و بیش 624 کلومیٹر) جانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور پھر کلکتہ سے واپس بکسر (فاصلہ کلکتہ سے بکسر کم و بیش 566 کلومیٹر) آنا عجیب سی بات لگتی ہے۔ جب کہ مرزا پور سے بکسر صرف 73 کلومیٹر ہے۔

(2) بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وجہ سے ایسا ہی کیا گیا تو پھر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ مرزا پور سے کلکتہ (624 کلومیٹر) کا فاصلہ ایک دن میں طے ہوتا ہے اور کلکتہ سے بکسر (566 کلومیٹر) کا نسبتاً کم فاصلہ طے کرنے میں دو دن لگتے ہیں۔

(3) میرے خیال میں دریائے ہگلی اقتباس میں مذکور تمام مقامات کو نہیں ملاتا۔

(4) اقتباس کے اخیر میں لکھا گیا ہے کہ ''4 دسمبر کو ہی ساڑھے گیارہ بجے دن کو جہاز ڈائمنڈ ہاربر سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو کیڈگری پہنچ گیا، جہاں سے دوسرے روز یعنی 9 دسمبر 1858 کو جا کر یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔''

(الف) ڈائمنڈ ہاربر سے کیڈگری ہوتے ہوئے رنگون کی بندرگاہ تک ایک دن میں پہنچنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

(ب) 4 / دسمبر کا اگلا روز 9 / دسمبر نہیں ہو سکتا۔

کچھ اور مقامات بھی غور طلب ہیں:

ص 124 سطر 22۔ ''بہادر شاہ ظفر 22 ستمبر 1857 (؟ صحیح 21 ستمبر) کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیے گئے۔ چار ماہ اور چھ روز تک وہ ناظر حسین مرزا کے تنگ و تاریک مکان میں انتہائی مجبوری اور بے بسی کے عالم میں قید رہے۔''

ص 218 سطر 7۔ ''گرفتاری کے بعد بادشاہ کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا تھا جیسا کسی بہت ہی برے اخلاقی مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کو آہنی سلاخوں میں تو نہیں رکھا گیا لیکن پھر بھی ان کی حالت انتہائی قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔''

درج ذیل اقتباس مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کی نفی کرتا ہے۔

ص 139 سطر 11۔ ''ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو سیاسی قیدی بنا کر تو رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔''

تضاد کی ایک اور مثال:

ص 234 سطر 20۔ ''بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں چھاپے خانوں کو خاص مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔'' ص 303 سطر 8۔ ''چوں کہ ظفر کا زمانہ چھاپے خانے کی مقبولیت سے ذرا پہلے کا رہا ہے۔''

کتاب کا پہلا حصہ بہادر شاہ ظفر کی سوانح، سیرت اور اٹھارہ سو ستاون کے واقعات کے بیان پر مشتمل ہے جسے تاریخی کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے یہ حصہ تاریخی شواہد کی روشنی میں مدلل طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اہم ماخذوں کو سامنے رکھا ہے لیکن تاریخوں کی صحت پر خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تاریخوں کی غلطیاں جو پوری کتاب میں موجود ہیں، ان میں سے چند ایک اس طرح ہیں:

ص 31 سطر 21-1787 بجائے 1887 لکھا گیا ہے۔

ص 74 سطر 10-29 جون 1846 بجائے 29 جون 1946۔

ص 87 سطر 16-23 اپریل 1847 کی بجائے 23 اپریل 1947۔

ص 148 سطر 22-28 اکتوبر 1862 کو منگل ہونا چاہیے نہ کہ پیر۔

ص 252 سطر 16-1257 ہجری، مطابق 42-1841 عیسوی ہونا چاہیے نہ کہ 42-1941 عیسوی۔

ص 253 سطر 13۔ دروازے کا سال تعمیر مصرعے سے 1271 ہجری نکلتا ہے نہ کہ 1257 ہجری مطابق 42-1841 عیسوی۔

ص 256 سطر 20-1262 ہجری مطابق 46-1845 عیسوی ہونا چاہیے نہ کہ 46-1245 ہجری۔

ص 284 سطر 6-1225 ہجری نہ کہ 1225 عیسوی۔

ص 284 سطر 18۔ پر ذوق کے انتقال کی تاریخ 19 نومبر 1854 عیسوی ہے جب کہ اگلے ہی صفحہ 285 سطر 12 پر 16 نومبر لکھی گئی ہے۔

ص 285 سطر 3۔ غالب کی رسائی بادشاہ کے حضور 22 شعبان 1267 ہجری کو ہوئی نہ کہ 1299 ہجری کو۔

ص 285 سطر 13-1857 عیسوی نہ کہ 1957 عیسوی۔

ص 294 سطر 22۔ کاتب کی درج کی ہوئی تاریخ 1267 ہجری کو حاشیہ نمبر 10 میں غلط بتاتے ہوئے 1266 ہجری لکھا گیا ہے جب کہ مصنف نے خود دیوان ثانی کے طبع کی تاریخ ص 294 ہی پر 1267 ہجری لکھی ہے۔

ص 349 سطر 22-1787 عیسوی نہ کہ 1887 عیسوی۔

ص 367 سطر 6-1787 عیسوی نہ کہ 1887 عیسوی۔

ص 375 سطر 8۔ دیوان ظفر ثانی کی تاریخ اشاعت 1267 ہجری ہے نہ کہ 1266 ہجری۔

دو چھوٹی غلطیاں یہ ہیں:

ص 309 حاشیہ نمبر 22 میں باب ''سیرت و شخصیت'' لکھا گیا ہے جب کہ اصل باب پر صرف ''شخصیت'' کا عنوان ڈالا گیا ہے۔

ص 374 سطر 13۔ ''آب حیات'' کے مصنف محمد حسین آزاد کا نام محمد حسن لکھا گیا ہے۔

ان غلطیوں میں کچھ تو مصنف کی اپنی معلوم ہوتی ہیں جو غلط اطلاعات کی فراہمی یا نیشنل آرکائیوز کی دستاویزوں پر مکمل بھروسہ کرنے کے سبب راہ پا گئی ہیں اور کچھ کاتب صاحب کے زور قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے جس طرح ظفر کی شاعرانہ صلاحیت سے بحث کی ہے، وہ مصنف کی ناقدانہ بصیرت کی دلیل ہے۔

دور اول میں اگر اشپرنگر اور محمد حسین آزاد نے ظفر کی شاعرانہ صلاحیت پر انگلی اٹھائی تو دور حاضر میں تنویر احمد علوی جیسے حضرات بھی ظفر کے کلام کو ذوق کا عطیہ ثابت کرتے رہے ہیں۔ اسلم پرویز نے اپنی تنقیدی اور تحقیقی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے جس طرح تنویر احمد علوی اور دوسرے حضرات کے مفروضات کو اپنی مدلل بحث کے ذریعے رد کیا ہے یہ انھی کا حصہ ہے۔ مصنف کا یہ کام لائق تحسین ہے لیکن ایک جگہ مصنف نے خود بھی ظفر کی شاعرانہ صلاحیت پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔

ص 305 پر مصنف نے ایک دلچسپ بحث کی ہے کہ ظفر نے قطعۂ تاریخ کے اس مصرعے: ''مرا اب یک قلم دیوان بستان معانی ہے'' میں لفظ 'مرا' مکتوبی لکھا ہے جب کہ یہ لفظ ملفوظی 'میرا' ہوتا ہے اور ظفر نے اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر دس عدد کی کمی پوری کی ہے۔'' ہمارے خیال میں اس طرح کی کوئی بات ہی نہیں۔ ظفر نے قاعدے کے مطابق اضافت والے لفظ 'بستان' سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق مصرعے میں لفظ بستان کی ملفوظی شکل بستانے بنتی ہے۔

مرا اب یک قلم دیوان بستانے معانی ہے

3241++ 30 170+++71 523+ +1224171=15 ہجری

اس طرح اس مصرعے سے 1224 ہجری کا مادۂ تاریخ بلا کم وکاست برآمد ہوتا ہے۔

ان معمولی فروگزاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب بہادر شاہ ظفر پر تحقیق کا اعلیٰ

نمونہ ہے۔ مصنف نے کتاب کے اختتام پر جس سائنٹفک طریقے سے کتابیات دی ہے، وہ ان کے تحقیقی ذوق کی غمازی کرتا ہے۔ ہر باب کے خاتمے پر مفصل حواشی اور ایک مفصل اشاریہ نے جو چار ضمنی عنوانات کے تحت دیے گئے ہیں، کتاب کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔

● **کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ**
مصنف: عبدالسلام صدیقی
صفحات: 298، قیمت:-/85 روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو ہند، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

کرشن چندر کا شمار اردو کے مقبول ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری اور ان کی شخصیت دونوں کے گرد ایک طلسماتی فضا کا ہالہ تھا اور ترقی پسندی کے دور عروج میں کرشن چندر اردو کے سب سے مقبول افسانہ نگار تھے۔ کرشن چندر نے افسانوں کے علاوہ اگرچہ کئی ناول بھی لکھے ہیں لیکن ان کی پہلی پہچان بہ طور افسانہ نگار ہی ہے۔ ان کے ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت ''شکست'' کو حاصل ہوئی اگرچہ بعض ناقدین نے اسے ہدف تنقید بھی بنایا ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان کا بنیادی سروکار زندگی میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں، نابرابریوں اور سماجی اور اقتصادی استحصال سے ہے۔ انھوں نے افسانوں میں کچھ فنی تجربے بھی کیے ہیں جس کی نمائندہ مثال ''ان داتا'' ہے۔ ان تجربوں نے ان کے بعض ناقدین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ان کے طویل افسانوں کو بھی ناول کہنے لگے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی نے ''کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی. ایچ. ڈی. کی سند حاصل کی ہے۔ ان کے پی. ایچ. ڈی. کے مقالے کو انجمن ترقی اردو ہند نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔

پہلا باب: ''اردو ناول پر سیاسی و سماجی تحریک کے اثرات'' ہے جسے دو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ''قبل آزادی ناولوں کا موضوع'' ہے جس میں 1857 سے 1947 تک کی سیاسی و سماجی صورت حال پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی بتاتے ہیں کہ ''کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول ''شکست'' 1943 میں ''لندن کی ایک رات'' اور ''گریز'' کے بعد لکھا جو اردو ناول نگاری میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ''گئودان'' کی طرح اس ناول میں بھی دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی کشمیر کی دیہاتی زندگی ہے جسے رومانی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے تاہم ناول نگار نے برسراقتدار طبقے کے مظالم اور غریب و نادار لوگوں کی مجبوری کو بھی موضوع بنایا ہے۔ دوسرے ذیلی باب کا عنوان ''بعد آزادی ناولوں کا موضوع'' ہے جس میں آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے ذکر کے ساتھ کرشن چندر کے ناولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''کرشن چندر کے ناولوں کے پلاٹ اور موضوعات'' ہے۔ یہ بھی دو ذیلی ابواب میں منقسم ہے اور اس میں عبدالسلام صدیقی نے کرشن چندر کے ناولوں کے پلاٹ کے مآخذ اور ان ناولوں کے سماجی سیاسی اور اقتصادی پس منظر کا مطالعہ پیش کیا ہے۔

تیسرا باب کرشن چندر کے ناولوں کے کرداروں پر ہے۔ یہ بھی دو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: ''کردار نگاری کی اہمیت'' اور ''طبقاتی، ارتقائی اور مثالی کردار''

چوتھا باب: ''ناولوں کی تہذیبی فضا'' ہے جس میں ناولوں کے ماحول، مکالموں اور زبان کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ پانچواں باب: ''کرشن چندر کا اسلوب'' ہے، اس میں مصنف کرشن چندر کی شاعرانہ زبان کے لیے مشرقی اور مغربی نقادوں کے حوالے سے تاویلات پیش کی ہیں، جبکہ اصرار واقعہ یہ ہے کہ کرشن چندر کی سب سے بڑی کمزوری ان کی شاعرانہ زبان ہی ہے جسے فکشن کے لیے غیر موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ چھٹا باب ہے ''اردو فکشن میں کرشن چندر کا مقام'' اس میں مصنف نے کرشن چندر کو اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب کرشن چندر کی ناول نگاری کا قابل مطالعہ جائزہ کہی جا سکتی ہے۔

● **صدائے آبجو**
شاعر: ارشد عبدالحمید
صفحات: 178، قیمت:-/150 روپے
ناشر: ارشد عبدالحمید، احمد ولا، کالی پلٹن، ٹونک-304001
مبصر: سعید اختر اعظمی، معرفت اردو بک ریویو، نئی دہلی

تخلیقی ادراک، قاری کے نظریات سے آگاہی اور تنقیدی بصیرت ایک تخلیق کار کے لیے بھی ضروری ہے۔ ارشد عبدالحمید نے تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لا کر سخن طرازی کی ہے تاکہ قاری اور تخلیق کے درمیان کی خلیج کو ختم کیا جا سکے۔ ''صدائے آبجو'' ان کے اولین تخلیقی رنگوں کی توس قزح ہے جس میں 1978 تا 2004 کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ کسی مخصوص فکری رویے یا نظریے سے وابستگی کے بغیر ارشد عبدالحمید نے سماجی رشتوں کے بکھراؤ، دیہی عناصر کے شہری رنگوں میں انجذاب، گمشدہ مقامیت، آبادیوں کے جم غفیر میں

فرد کی گمشدگی اور اجنبیت کے احساس کے ساتھ اثاثۂ عشق میں ماورائیت کے بجائے جنسی رجحان کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ جذبہ محض روح کی ضرورت نہیں جسمانی تقاضوں کی تسکین بھی ہے۔ کمسنی کے عالم میں بدن سے سوندھی شراب کی خوشبو کا اٹھنا، برف کے گالے سے بدن کی تپش اور وصالی شب میں بازوؤں کے حصار میں سمٹنے سے لے کر چاند تاروں کی نمائش میں رات کی چوٹی کھسکنے کے ایسے کامیاب استعارے ہیں جو ان کی شاعری کو امتیاز واختصاص عطا کرتے ہیں۔

نئے ردیف وقوافی کے التزام کے ساتھ انھوں نے فصیل صبر، سیاہ طیش، ریال خواب، امیر شوق، تفنگِ درد، زخم خوردہ اڑان، شب کا اندھا سمندر، مشرق کو ہساروں کی دہلیز، دھوپ کا پرندہ، آرزوؤں کے دالان، خوابوں کے سوئے ہوئے کمرے، دل کی سونی حویلی، یادوں کے دیے کی بیداری، حرف خواب، خاک خواب کو پلکوں سے جھٹکنے، کوزۂ جاں کا قیدی، دجلۂ غم سے نبرد آزمائی، خیمۂ درد کی تنہائی، دشت غزل میں غزالان خیال کی چوکڑی، ریشمی شالوں سے موتی کے گرنے، الگنی پر بیٹھی دھوپ کی اشک شوئی اور اداسی کی پلکوں پر بھیگے ہوئے دھوئیں کو جس طور پر اپنی شاعری میں برتا ہے وہ ان کی وسعتِ فکر، عمیق مطالعہ اور بالغ نظری کی دلیل ہے۔ بطور نمونہ یہ چند اشعار:

وہ عرصے بعد سرِ بام خواب آئے ہیں
نگارِ صبح ترا چونکنا مناسب ہے
سحر سے قبل گھروں سے نہ کوئی نکلے گا
اداس رات کے آنسو کسے پکارتے ہیں
کوئی تو چاند ان آنکھوں کی گہری جھیل میں اترے
لبوں کی کشتیوں میں پھول سی مسکان رکھ جائے
وہ اور میں کہ جو غم کو غلط بھی کرتے ہیں
یہ دل تو ہجر سے حیران رہ گیا ہے بس
خوب یہ طرزِ بیان ہے حق میں مجاز ملا ہوا
پھول لبوں میں دبے ہوئے، چاند پلک پہ رکا ہوا

اداس رات کو مہکانے اور خیال وخواب کو استعارہ کرنے کے تمنائی ارشد عبدالحمید گاؤں اور شہر کے تہذیبی تصادم کے پس منظر میں دھوپ، پنگھٹ، کھیت، پانی، کٹورے، ناریل کے ڈونگے، کورے مٹکے اور خوشبوئے گلاب کے مدّ مقابل ملوں کا مزدوروں کو نگلنے کا عمل، ریت کے بکھرے ہوئے ذروں میں مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش کی تلاش اور اخبار تھامے ہوئے چائے کے گھونٹ بھرنے کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایک پل کو ماضی میں گم سے ہوجاتے ہیں۔ انھیں امید قوی ہے کہ گاؤں کے چوپال کے برگد کی تنہائی اور سونی پگڈنڈیاں یقیناً آباد ہوں گی تبھی تو وہ خدا کے حضور گاؤں کو مسکان دینے والی دعا کے مستجاب ہونے کے منتظر ہیں۔

اودے پور، ٹونک اور راجستھان سے یک گونہ اظہار تعلق کرنے والے ارشد عبدالحمید نے نیو، سموچی اور پیڑھی جیسے ہندی الفاظ کا بھی اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا ہے جو غزل میں نئے لفظوں کو سمونے کی ان کی خواہش کا اشاریہ ہے۔ مخمور سعیدی اور شین کاف نظام کے فاضلانہ تجزیوں سے آراستہ، ارشد عبدالحمید کا یہ مجموعۂ کلام جسے صابر حسن رئیس نے مرتب کیا ہے، اچھی شاعری کے قدر شناسوں کو مایوس نہیں کرے گا۔

● کیفی

مرتب: ڈاکٹر شباب الدین

صفحات: 262، قیمت: -/150 روپے

ناشر: شعبۂ اردو، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ، (اتر پردیش)

مبصر: عرفان احمد، 28/8، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی-110025

زیر تبصرہ کتاب ''کیفی'' میں شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ کے زیر اہتمام ''کیفی اعظمی: حیات و خدمات'' کے عنوان پر منعقدہ دو روزہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کو یکجا کروایا گیا ہے۔ اس سیمینار میں ملک کے مختلف مقامات سے اکابرین نے شرکت کی اور 27 مقالے پڑھے گئے جن میں کیفی اعظمی کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

کیفی اعظمی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں ایک رومان پسند شاعر تھے اور اپنی غزلوں اور نظموں میں جمالیات کو ہی ترجیح دیتے تھے، لیکن پھر وہ سماج میں پھیلی ہوئی نابرابری اور ناانصافیوں سے بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ ادبی رجحان کا بھی رخ موڑ دیا اور انقلابی نظمیں لکھنے لگے۔ انگریزی حکومت کے جابرانہ نظام اور ملک میں پھیلا ہوا افلاس ان کی نظموں کا خاص موضوع ٹھہرا۔ بھوک اور افلاس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی طبیعت گل وبلبل اور شراب وشباب کی جگہ زندگی کے تلخ مسائل کی طرف مڑ گئی۔

کتاب میں شامل مقالات میں تقریباً ایک ہی طرح کے خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے لیکن کچھ مقالے تھوڑا بہت ہٹ کر بھی لکھے گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے کیفی کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' (دوسرا اجلاس) کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے انھوں نے کیفی کی بعض مشہور نظموں اور غزلوں کو علامہ اقبال کی شاعری کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کا مقالہ اعتدال پسندانہ اور جامع ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کیفی اعظمی کے مجموعے ''میری آواز سنو'' کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ ابوسفیان اصلاحی کا مقالہ کافی طویل ہے جس میں انھوں نے کیفی کے ادبی رویوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کیفی اعظمی کی عوامی

شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے۔ مختصر یہ کہ ''یگانہ'' میں شامل مقالے یگانہ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ نے یگانہ اعظمی کی یاد میں دو روزہ قومی سیمینار منعقد کر کے اور سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل دے کر مرحوم شاعر کو سچا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

● **گلدستۂ بیت بازی**

مرتب: وسیم اقبال صدیقی

صفحات: 216، قیمت: -/100 روپے

ناشر: سب رنگ آرٹس اینڈ کرافٹس، مدح گنج لکھنؤ-226020

مبصر: نوشاد عالم، 243 سابر متی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی-110067

بیت بازی کی افادیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ اس سے کلیات کے ادبی ذوق کی آبیاری اور اسے جلا دینے میں بہت مدد ملتی ہے۔ کھیل کھیل میں اساتذہ کے اشعار از بر ہوتا، اور ان کو گاہے بہ گاہے اپنی گفتگو میں استعمال کرنا اور ان اشعار کی مدد سے اپنی بات زیادہ تر مؤثر اور کارگر انداز میں پیش کرنا، بیت بازی کے وسیلے سے حاصل ہونے والے چند بہ یہی فائدے ہیں۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں ہیں ان میں سے تین یہ ہیں جو زیادہ پرانی بھی نہیں، ڈاکٹر کاظم علی خاں کی ''رہنمائے بیت بازی'' اور دو کتابیں جناب منظور عثمانی کی ''چمن در چمن'' اور ''صد گلستان'' لیکن زیر تبصرہ کتاب ان سے خاص مختلف ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جس میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ اور مربوط انداز میں ان ضوابط کو یکجا کیا گیا ہے جو منتشر مواد کی شکل میں مختلف کتابوں اور رسالوں میں بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی مرتب نے بیت بازی کے علمی و سماجی فائدے بیان کر کے اس کی اہمیت کو اور بھی آشکارا کر دیا ہے۔ کتاب کا انتساب بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے، اسے پڑھ کر مرتب کی ذہانت اور اردو کی شعری روایت پر ان کی نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مرتب نے اشعار کی ترتیب میں جس سلیقے کا ثبوت دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جہاں ایک طرف ولی، میر، مومن، غالب اور قائم جیسے قدیم شعرا اور ثاقب جیسا اور اقبال جیسے وسطی شعرا ہیں وہاں دور حاضر کے شعرا بھی ''گلدستۂ بیت بازی'' کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''گلدستۂ بیت بازی'' قدیم و جدید کا حسین سنگم ہے۔ چونکہ مرتب کی نظر طلبہ کی ذہنی تربیت پر بھی ہے اس لیے فحش اور غیر مناسب اشعار کو مجموعے میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ بہت سے غیر معروف شعرا کے اچھے اور معیاری اشعار کو بھی جگہ دی ہے اور جن اشعار میں شاعر کا تخلص آیا ہے ان کو مجموعے میں فوقیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بیت بازی کے فوائد، اس کے رہنما اصول، شعرا کا اختصار کے ساتھ تعارف، مشکل اور ادق الفاظ کے معانی، بیت بازی میں کامیابی کے گُر اور ماخذ کی تفصیلات دیکھ کر مرتب کی جانفشانی اور رومانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو حروف تہجی سے شروع ہونے والے اشعار ترتیب وار پیش کیے گئے ہیں تو دوسری طرف ان اشعار کے حرف ردیف کی ترتیب کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ بیت بازی کا مقابلہ عام طور پر دو بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حرف ردیف کی بنیاد پر بیت بازی ہو یا پھر کسی عنوان یا موضوع کے تحت۔ چونکہ اول الذکر نسبتاً آسان ہے اور رائج ہے اس لیے مرتب نے بھی اس کو روا رکھا ہے۔

امید ہے کہ اردو داں حلقہ اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کرے گا اور طلبہ اس میں بیان کردہ اصول وضوابط اور فوقیت پانے کے نکتوں کو عمل میں لا کر بیت بازی کے مقابلوں میں کامیابی حاصل کریں گے۔ کتاب کی قیمت اور گیٹ اپ مناسب ہیں۔ متن کی کمپوزنگ میں مناسب فاصلہ نہ ہونے سے خاطر خواہ خوبصورتی نہیں پیدا ہو سکی ہے۔ □□□

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے ممتاز ترین ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی تحریروں نے قارئین کے ایک بڑے حلقے کو مسحور کیا ہے۔ قومی اردو کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، خاکے، فلم اسکرپٹ، ناول اور خطوط شامل ہیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں منٹو کی تین کتابیں ''آتش پارے'' منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' شامل ہیں۔

صفحات: 565

قیمت: -/285 روپے

انور ادیب

عظیم سائنسداں پروفیسر عبدالسلام

تیسری دنیا کے عظیم سائنسداں پروفیسر عبدالسلام کو ان کے سائنسی کارناموں کی وجہ سے سائنس میں پسماندہ ممالک کا مسیحا کہا جاتا ہے۔ وہ مسلم دنیا کے واحد سائنسداں تھے جنھیں نوبل پرائز کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی داستانِ حیات عزم اور حوصلے کی ایک قابل تقلید مثال ہے۔ عبدالسلام کی پیدائش 29 جنوری 1926 کو لاہور کے ایک قصبے جھنگ میں ہوئی۔ ان کے والد ایک شریف اور نیک انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ گھر کا ماحول خلوص، محبت اور خاکساری کا آئینہ دار تھا۔ نیکی اور اخلاص کے اس ماحول نے عبدالسلام کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

عبدالسلام کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ میٹریکولیشن کے امتحان میں وہ نہ صرف اول آئے بلکہ پنجاب یونیورسٹی کے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اس سے ان کی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ 1940 کی بات ہے۔ 1946 میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے ریاضی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ 1949-1946 تک کا عرصہ انھوں نے سینٹ جونس کالج (کیمبرج) میں فاؤنڈیشن اسکالر کی حیثیت سے گزارا۔ کیمبرج میں طلبہ کی علمی لگن اور ڈسپلن نے انھیں بے حد متاثر کیا اور انھوں نے سوچا: کاش ہماری قوم کے اندر بھی حصولِ علم کا ایسا ہی جذبہ ہوتا۔

عبدالسلام صاحب ریاضی میں غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ اس صلاحیت کی بنا پر کیمبرج یونیورسٹی نے انھیں Wrangler کے اعزاز سے نوازا۔ یہ اعزاز ریاضی میں غیر معمولی صلاحیت کے حامل لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ بعد میں مطالعۂ کائنات کے مشہور ماہر Cosmdogist فریڈ ہوائل (Fred Hoyle) کے مشورے سے وہ فزکس کی طرف متوجہ ہوئے۔ نظریاتی طبیعیات (Theoretical Physics) میں ایک تحقیقی مقالہ لکھنے پر انھیں کیمبرج یونیورسٹی نے 1950 میں اسمتھ پرائز سے نوازا۔

تعلیمی فراغت کے بعد 1951 میں عبدالسلام صاحب پاکستان واپس آگئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر ہوگئے 1952 میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے صدر مقرر کیے گئے۔ اسی سال (1952) میں انھیں اپنے تحقیقی مقالے پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے تفویض کی گئی۔ ان دنوں پاکستان میں سائنس کی ترقی کے لیے فضا سازگار نہیں تھی۔ ان کا تحقیقی ذہن سائنس کے فروغ و ارتقا کا متلاشی تھا۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا اور 1954 میں پنجاب یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر لندن چلے گئے جہاں کیمبرج یونیورسٹی میں انھیں لکچرار کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ 1956 تک رہے۔ مغربی ملکوں میں سائنس دانوں کے اعزاز و احترام سے وہ بے حد متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ تیسری دنیا میں بھی سائنسدانوں کی قدر و منزلت ہو۔ 1955 میں اقوام متحدہ کی جانب سے جینوا میں ایٹم فار پیس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ عبدالسلام صاحب

اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1957 میں انھیں امپیریل کالج لندن میں نظریاتی طبیعیات کا شعبہ قائم کرنے کے لیے مامور کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر 31 سال تھی۔ یہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کا ثبوت تھا۔ 33 سال کی عمر میں انھیں رائل سوسائٹی لندن کا رکن (Fellow) منتخب کیا گیا۔ وہ اس سوسائٹی کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جس سے وہ اس کم عمر میں سرفراز ہوئے۔

پروفیسر عبدالسلام کا سب سے اہم کارنامہ ایک بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعیات کا قیام ہے۔ یہ مرکز انھوں نے 1964 میں Trieste, Italy میں قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد تیسری دنیا کے ممالک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف راغب کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تیسری دنیا کے سائنس داں ترقی یافتہ ملکوں کے سائنس دانوں کے علم اور تجربے سے مستفید ہوں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس بین الاقوامی مرکز میں ہر سال دنیا کے عظیم ماہرین طبیعیات جمع ہوتے ہیں اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ سیمینار کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس طرح تیسری دنیا کے سائنس دانوں کو سائنس کے میدان میں تازہ ترین معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو اس مرکز کی طرف سے قیمتی سائنسی کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کو غریب اور پسماندہ ممالک کی غربت اور جہالت بے چین رکھتی تھی۔ اس ادارے کا قیام ان کی اسی بے چینی اور اضطراب کا ثمرہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی حاصل کیے بغیر تیسری دنیا کی غربت اور افلاس کا خاتمہ ممکن نہیں۔ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کا اپنے ملک کو چھوڑ کر مغربی ممالک میں جا بسنے کا رجحان انھیں پریشان کرتا تھا۔ لہٰذا پسماندہ ممالک میں سائنسی سہولیات اور سائنسی ماحول کی کمی کو ٹرسٹے میں اس ادارے کے قیام سے انھوں نے پورا کرنے کی کوشش کی۔

1971 میں عبدالسلام صاحب کو یو ایس ایس آر اکیڈمی آف سائنس کے Foreign Member کے اعزاز سے نوازا گیا اور 1979 میں امریکہ کے نیشنل اکاڈمی آف سائنس نے Foreign Associate کے اعزاز سے سرفراز کیا اور اسی سال (1979) میں انھیں فزکس میں نوبل پرائز کا اعزاز بھی ملا۔ ان اعزازات کے علاوہ دنیا کی تیس یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی شامل ہے۔ ٹرسٹے میں بین الاقوامی مرکز برائے سائنس کے قیام سے پروفیسر عبدالسلام تیسری دنیا کے سائنس کے مسیحا بن کر ابھرے۔ پسماندہ ممالک کے لیے انھوں نے 1984 میں تھرڈ ورلڈ اکاڈمی آف سائنس قائم کی۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد بھی غریب ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینا تھا۔ تیسری دنیا کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف مائل کرنے والے پروفیسر عبدالسلام نے 1996 میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔ لیکن ٹرسٹے میں قائم کردہ ان کا عظیم ادارہ اور سائنس کی دنیا میں ان کے کارہائے نمایاں آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں۔

□□□

:پتہ
Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla,
ASANSOL-713302 (W.B.)

خسرو متین

ایمبولینس کی کہانی

ایمبولینس اس گاڑی کو کہتے ہیں جو کہ نازک مریضوں اور زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے کام آتی ہے۔ یہ گاڑیاں جدید طبی سامان سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اسپتال پہنچنے سے قبل مریض کو فوری طبی امداد انھی گاڑیوں میں دستیاب ہو جاتی ہے اور بہت سے مریض اور زخمی صحت یاب ہو کر کامیاب زندگی گزارتے ہیں، لیکن ایک زمانہ تھا جب ایمبولینس یا اس قسم کی فوری طبی امداد دستیاب نہ ہونے کے باعث بہت سے لوگ بے موت مر جاتے تھے۔

اس کے سامنے والے شیشے پر الٹے حرفوں میں ایمبولینس لکھا ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے لکھا جاتا ہے تاکہ آگے جانے والی گاڑیاں اپنے عقب نما آئینہ میں اس کے سیدھے عکس کو آسانی سے پڑھ سکیں اور اسے راستہ دے دیں۔

ایمبولینس کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی؟ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے پرانے زمانے میں جنگ کے دوران زخمی سپاہیوں کو میدان جنگ سے باہر لے جانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ زخمی سپاہی خون بہہ جانے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے تھے یا پھر قاتح فوج انھیں قتل کر دیتی تھی۔ زخمیوں کا میدان جنگ میں مر جانا ہی مقدر سمجھا جاتا تھا۔

زخمی سپاہیوں کو میدان جنگ سے باہر لانے اور انھیں طبی امداد پہنچانے کے لیے سب سے پہلے ایمبولینس کا استعمال فرانس میں 1792 میں کیا گیا۔ یہ ایمبولینس ایک گھوڑا گاڑی کی شکل میں تھی۔ نپولین کے خاص معالج بیرن ڈی منک جان لارے نے جب زخمی سپاہیوں کو میدان جنگ میں یوں بے بسی سے مرتا ہوا دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے زخمی سپاہیوں کو گھوڑا گاڑی میں لٹا کر کسی محفوظ جگہ پہنچانے کا کام انجام دیا۔ دوران سفر کئی زخمی جاں بحق ہو جاتے تھے۔ جان لارے نے سوچا اگر انھیں دوران سفر بھی طبی امداد بہم پہنچائی جا سکے تو کئی زخمیوں کو بچایا جا سکتا ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود اس نے اس گھوڑا گاڑی ایمبولینس میں کچھ سہولتیں فراہم کیں۔ اس طرح ہیرن ڈی منک جان لارے کو پہلا فوجی معالج ہونے اور ایمبولینس کا موجد کہلانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے ہوائی ایمبولینس کی بھی ایجاد کی۔ اس ایمبولینس میں زخمی کو ایک ٹوکرے میں لٹا کر ایک بڑے غبارے کی مدد سے میدان جنگ سے دور بھیج دیا جاتا تھا تاکہ اسے فوری طبی امداد دی جا سکے مگر اس قسم کی ایمبولینس میں کئی خطرات تھے۔ صحیح سمت و مقام کے بجائے ادھر ادھر بھٹک جاتا تھا یا پھر کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہ ایمبولینس زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔

1859 میں امریکہ کے کچھ ڈاکٹروں نے واشنگٹن میں ایک کانفرنس منعقد کی اور اس بات پر زور دیا کہ ایمبولینس میں کچھ طبی سامان اور سہولتیں ہونی چاہئیں تاکہ زخمیوں کو فوری مدد دی جا سکے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کی ایمبولینس کی تجویز کو منظور کیا گیا۔ ایک ایمبولینس بڑی گاڑی کی شکل میں ہوگی جس میں چار پہیے لگے ہوں گے۔ دوسری چھوٹی دو پہیوں والی گاڑی ہوگی۔

1864 میں امریکی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد کو منظور کیا جس کی رو سے امریکی فوج میں ایمبولینس کا رکھنا لازمی بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسے ڈاکٹروں کی تقرری بھی عمل میں لائی گئی جن کا کام دوران جنگ زخمیوں کو اسپتال تک پہنچانا تھا۔ 1864 میں ہی جینوا میں جنگ

کے قاعدے قانون بنانے کے لیے ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ بھی طے ہوا کہ ایمبولینس پر کسی قسم کا حملہ نہیں کیا جائے گا اور اسے راستے کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

موٹر کار کی ایجاد کے بعد ایمبولینس کی کارکردگی میں ایک خوش آئند انقلاب آیا۔ 1900 میں امریکہ نے پہلی مرتبہ موٹر کار کو ایمبولینس کے طور پر استعمال کیا۔ فوجی اسپتالوں کے ساتھ ساتھ عام شہریوں کے لیے بھی ایمبولینس کا استعمال ہونے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں اور طبی سہولتیں فراہم ہوتی گئیں۔ اس طرح فرانسیسی معالج بیرن ڈی منگ جان لارے کا خواب تقریباً دو سال سے زائد عرصے میں شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔

□□□

پتہ:
K-52, Batla House, Okhla, New Delhi-25

شکست پندار

مصنفہ: جین آسٹن، مترجم: عبدالعلیم قدوائی

انگریزی کی مشہور زمانہ ناول نگار کے ناول ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈیس'' کا ترجمہ عبدالعلیم قدوائی نے کرداروں کی مناسبت کے لحاظ سے ''شکست پندار'' کیا ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1813 میں شائع ہوا تھا جس میں اس وقت کے انگلستان کے متمول اور متوسط طبقے کے سماجی رجحانات، معاشرتی الجھنیں اخلاقی عیوب، روزمرہ کے حالات اور دیہی علاقوں کے دلکش قدرتی مناظر کی مصوری حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس کے بہت سے معاملات اور حالات ہمارے ملک سے مماثل نظر آتے ہیں۔

صفحات: 341، قیمت: 216 روپے

شعور و احساس

مصنف: جین آسٹن، مترجم: عبدالعلیم قدوائی

عبدالعلیم قدوائی نے انگریزی کی مشہور زمانہ ناول نگار جین آسٹن کے ناول ''سینس اینڈ سنسبلٹی'' کا اصل کی خصوصیات کے ساتھ سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ امریکہ کی جنگ آزادی اور انقلاب فرانس جیسے تاریخی واقعات کے بعد جو زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات باقی تھیں انھی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں اور روایتی اخلاق پرستی کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اس ناول کی اشاعت کو دو سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تھیٹر سے لے کر، ریڈیو، پردۂ سیمیں، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر پر بھی نشر کیا جا رہا ہے۔ قومی اردو کونسل نے کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس ناول کا اردو ترجمہ ''شعور و احساس'' کے نام سے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

صفحات: 309، قیمت: 210 روپے

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہد ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کا نظامِ جمال (جلد اول، دوم، سوم)	1311.00	328.00
19	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
20	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
21	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
22	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
23	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
24	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
25	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
26	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
27	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
28	انسانی ارتقا	70.00	18.00
29	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

30	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد-1-6)	3400.00	850.00
31	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد-4-1اور6-8)	1790.00	448.00
32	جنت سنگار	180.00	45.00
33	کلیاتِ پریم چند (جلد1 تا24)	4071	1018.00
34	للّو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
35	لغت ابجد شماری (جلد-1، حصہ دوم)	472.00	118.00
	لغت ابجد شماری (جلد-2، حصہ اول ودوم)		
36	مجموعۂ نغز	268.00	67.00
37	مسدود راہیں	126.00	32.00
38	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
39	مولیئر	57.00	14.00
40	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
41	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
42	پشکن	60.00	15.00
43	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
44	قدیم ہندوستان میں شُودر	82.00	21.00
45	قومی زبان	76.00	19.00
46	قواعد کیلیلاگ سازی	268.00	67.00
47	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
48	سیر کہسار	167.00	42.00
49	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
50	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
51	تنقید عقل محض	158.00	40.00
52	تاریخ طبعی (جلد-1)	43.00	11.00
53	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
54	تشریح تصاویر	66.00	17.00
55	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
56	تذکرۂ مخطوطات (جلد-5-1)	431.00	108.00
57	تالستائے	46.00	11.00
58	اصولِ معاشیات	47.00	12.00
59	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
60	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
61	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
62	وضاحتی کتابیات (جلد1، 3-22)	2650.00	663.00

63	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
64	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
65	عکس اور برعکس	128.00	32.00
66	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
67	بھارت 2004	250.00	63.00
68	دھوپ چولھا	38.00	10.00
69	اجارہ	131.00	33.00
70	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 6	1163.00	291.00
71	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
72	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	13.00	03.00
73	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
74	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
75	ارتقائے کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
76	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
77	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
78	کائنات جلیل	80.00	20.00
79	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
80	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
81	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
82	پیمائش و نقشہ کشی	85.00	21.00
83	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
84	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	98.00	25.00
85	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
86	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
87	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
88	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
89	سخنوران گجرات	77.00	19.00
90	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
91	تاریخ آصفی	58.00	15.00
92	اجرتیں	95.00	24.00
93	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	178.00	45.00
94	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2008 تک دی جائے گی۔

نوٹ: محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدرشناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت: -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلی کی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "اگر اپنا کہا آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے" مشہور ہے۔ غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ لکھا ہے اس میں وہ غالب سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو نے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی بڑی کوشش سے یکجا کردیے ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات اس دور کے شعرا کا ذکر آنے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے سات سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب سے متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت: -/128 روپے

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کلیات فانی

مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز سخن جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 318، قیمت: -/63 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یورپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت: -/145 روپے

اڑیسہ میں اردو

مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور ثقافتی پس منظر بیان کیا گیا ہے، دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری کے ارتقا اور تیسرا اردو نثر کے ارتقا کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب دو فصلوں میں منقسم ہے اڑیسہ کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے اور اڑیسہ میں اردو صحافت۔ باب پنجم چار ذیلی عنوانات پر مبنی ہے اڑیسہ میں عہد جدید میں اردو، اردو تعلیم کی صورت حال، اردو کے ادبی اور ثقافتی ادارے، اردو کی اشاعتی سرگرمیاں۔ چھٹا باب حاصل مطالعہ کے عنوان سے ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر ایک جامع اور مستند کتاب۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

نوٹ:- طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

Date of Publication : 24/08/2007

URDU DUNIYA Monthly, September 2007, Vol. 9, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار [illegible] آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938